رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

ربیع الاخر ۱۳۷۷ھ جلد ۴۹ عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ ۔ اے ذیلدار پارک ، اچھرہ ۔ لاہور پاکستان

خالی صفحه

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۹ | ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ مطابق جنوری ۱۹۵۸ء | عدد ۴

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جنوری کے پہلے ہفتہ میں پنجاب یونیورسٹی کے تحت ایک بین الاقوامی اسلامی مجلسِ مذاکرہ منعقد ہوئی۔ اس مجلس کو حکومتِ پاکستان کی سرپرستی حاصل تھی اور اس کے وسیع تر انتظامات کے لیے حکومت نے یونیورسٹی کو سات لاکھ روپے کی زرِ خطیر بھی عطا کی۔ بیس ممالک کے تقریباً سوا سو سے زائد اہلِ علم حضرات اس میں شریک ہوئے۔ ان شرکاء میں ہر ذہن اور ہر طرزِ خیال کے لوگ موجود تھے۔ وہاں اگر ایک طرف شیخ بہجت البیطار، عمر بہاء الامیری، مصطفےٰ زرقا، ابوزہرہ جیسی صحیح العقیدہ اور صحیح خیال متوازن شخصیتیں نظر آئیں تو دوسری طرف بعض ایسے تجدد پسند اصحاب بھی ملتے جو اسلام کا ماڈرن ایڈیشن تیار کرنے میں منہمک ہیں۔ ان کے علاوہ وہاں بعض ایسے غیر مسلم مستشرقین بھی شریک تھے جو اسلام اور اسلامی دنیا کے مسائل کو پوری دیانتداری سے سمجھنے کے آرزومند ہیں اور ان معاملات میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ مگر انہیں شامل ہونے والوں میں ایک مختصر سا طبقہ ایسا بھی موجود تھا جن کی اسلام اور مسلمان دشمنی کسی سے پوشیدہ نہیں اور جو یہاں آکر بھی اسلام کے خلاف اپنے چھپے ہوئے بغض و کینہ کو ہزار سعی کے باوجود چھپا سکنے میں کامیاب نہ ہوا اور کبھی کبھی اُس کے دل کا زہر زبان پر آکر الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو جاتا تھا۔

اس مجلس مذاکرہ کے آغاز سے کافی پہلے اس کے متعلق فضا میں مختلف قسم کی بدگمانیاں پھیلنی شروع ہوئیں۔ بعض لوگوں نے اسے دینِ حق کے لیے ایک فتنۂ عظیم خیال کیا بعض نے اسے مغربی استعمار پسندوں کی ایک مقدس چال سے تعبیر کیا۔ بعض نے اسے شہرت کے بھوکوں کے لیے ایک نادر موقع سمجھا۔ الغرض مختلف قسم کے وساوس لوگوں کے دلوں میں موجود تھے۔ اس ملک کی عام آبادی

اسے محض ایک میلے سے زیادہ حیثیت نہ دیتی اور اس سے کسی خیر کی توقع وابستہ نہ رکھتی تھی۔
ممکن ہے اس قسم کی بدگمانیاں پھیلانے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جن کی نیت بخیر نہ ہو۔ لیکن اکثر لوگ بالکل نیک نیتی کے ساتھ اسے ایک فتنہ سمجھ رہے تھے اور ہمارے ملک کی عام آبادی کے خدشات بھی بالکل بے بنیاد نہ تھے۔ اس مجلس مذاکرہ کے بارے میں بعض خطرات کا اظہار بالکل فطری تھا اور بعض ایسے ٹھوس وجوہ تھے جن کی بنا پر اس مجلس کے متعلق حسنِ ظن رکھنا بہت مشکل تھا۔

اس مجلسِ مذاکرہ سے پہلے امریکہ میں جو کلوکیم منعقد ہوا وہ اسلام کے خلاف ایک خطرناک سازش تھی۔ اُس میں جو کارروائی کی گئی اُس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اسلام کی بنیادوں کو اس طرح سے منہدم کر دیا جائے کہ یہ ایک انقلاب انگیز تحریک کی حیثیت سے زندہ نہ رہے اور مغربی استعمار پسندوں کا آلۂ کار بن جائے۔ کلوکیم کا یہ مقصد اس قدر بنیادی اور اساسی حیثیت رکھتا تھا کہ اس کی پوری کارروائی میں یہ جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ چنانچہ بیروت یونیورسٹی کے ایک امریکی نژاد وائس چانسلر ڈاکٹر بایڈورج نے اس حقیقت کا وا شگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

"ماضی میں اسلام اور مسیحیت کے درمیان معاندانہ رشتہ تھا لیکن اب وقت آگیا ہے کہ دونوں مذہب متحد ہو کر مادیت کا مقابلہ کریں جو اس وقت روحانی اقدار، ایمان و ایقان کی عمارت کو ڈھانے کے درپے ہے۔"

اسی طرح ایک اور مقالہ نگار جان کیمبل روسی جارحیت کا خطرہ پیش کر کے عالمِ اسلام کو اس بات پر اُبھارتا ہے کہ وہ ایک مشترکہ دفاعی ادارے میں شریک ہو کر سرخ خطرے کا مقابلہ کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اسلامی ممالک کو اس امر کا بھی یقین دلاتا ہے کہ اُن کی عسکری قوت کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے مغرب انہیں ہر قسم کی مدد دیگا۔
اس معاملہ کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی واحد قابلِ عمل صورت ان استعمار پسندوں کے نزدیک ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ کسی طرح ایسی بنیادیں فراہم کی

جائیں جو مشرق و مغرب میں مشترک ہوں۔ ایسی بنیادوں کی تلاش و جستجو ظاہر ہے کہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلمان اُس دین کو مانتے ہیں جو انہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہے۔ وہ دین جس کے متعلق یہ فرمایا گیا ہو ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ، وہ دین جو اپنے پیروؤں سے اس بات کا تقاضا کرے کہ وہ اپنی جملہ خود مختاریوں کو ترک کر کے خدا کے ساتھ اپنے تعلق میں یکسو ہو جائیں اور اُس وقت تک چین نہ لیں جب تک کہ یہ دین دنیا کے سارے ادیان پر غالب نہ ہو جائے، اُس کے ماننے والوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ کبھی بھی غیر ملکی سامراج کے آلۂ کار بن سکتے ہیں ایک بہت بڑی حماقت ہے۔ اس کے لیے اگر کوئی گنجائش نکل سکتی ہے تو یہ صرف اُسی شکل میں ممکن ہے کہ اسلامی عقائد میں تزلزل اور ضعف پیدا کیا جائے، مسلمانوں میں اس باطل خیال کی تخم ریزی کی جائے کہ اسلامی تعلیمات عہد حاضر کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں، اور ان کے دماغوں میں یہ بٹھایا جائے کہ ان کے بقا اور ترقی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ دینِ حق کو مسجد کی چار دیواری میں محدود کر کے اپنے ملکی اور اجتماعی مسائل میں ہدایت الٰہی کے بجائے مغرب کی رہنمائی قبول کر لیں۔ ان شر انگیز خیالات کے چند نمونے ہمیں سابق کلوکیم کی کارروائیوں میں ڈاکٹر ہیدر کے مقالے میں مل سکتے ہیں جس میں مسلم قوم کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ نبوت، معجزات، نماز اور حیات ایسے اساسی اور بنیادی عقائد پر بھی نظرِ ثانی کریں اور انہیں جدید نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں از سرِ نو مرتب کیا جائے۔ اُس کا خیال یہ ہے کہ وحی زمان و مکان کے تقاضوں کے تحت نازل ہوتی ہے، اس لیے وہ ہمیشہ نظرِ ثانی اور تصحیح کی محتاج رہتی ہے۔ اسی طرزِ فکر کی تائید میں ایک دوسرے مقالہ نگار ڈاکٹر ہیرلڈ سمتھ نے بھی یہی زہر افشانی کی ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ الفاظ کے سانچے اضافی ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے متعلق یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ہر عہد میں، ہر قسم کے معاشرتی، اور معاشی حالات کے تحت ابدالآباد تک صحیح اور برحق ہیں۔ ان کا گاہے بگاہے تبدیل کرتے رہنا فطرت کا ایک اہم تقاضا ہے۔

اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے امریکی کلوکیم میں نہایت ہی کمینے اور اوچھے ہتھکنڈے اختیار کیے گئے تھے۔ شریعت اسلامی کے مجموعی ڈھانچے میں سے نہایت عیاری کے ساتھ چند ایسی چیزوں کو منتخب کر لیا گیا۔ جو جدید تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ رواج کے خلاف پڑتی ہیں اور انہیں موضوعِ سخن بنا کر مسلمانوں کے دماغ کو پراگندہ کرنے کی مسلسل کوشش کی گئی۔ ان موضوعات میں پردہ اور ضبطِ تولید پر خاص طور پر طبع آزمائی کی گئی۔

اسلام سے مسلمانوں کو متنفر کرنے کے لیے ایک کوشش یہ بھی کی گئی کہ مسلمانوں کے دل میں اُن جاہلی تہذیبوں کی محبت جاگزیں کی جائے جو اسلامی انقلاب سے پہلے، مختلف اقوام میں رائج تھیں۔ کلوکیم کے ارباب حل و عقد نے خاص طور پر ایسے مقالے لکھوائے تھے جن کو سننے اور پڑھنے سے مسلمان ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت جیسے پاک اور مقدس رشتوں میں بندھنے کی بجائے نسلی اور روائتی علائق سے وابستہ ہوں۔ اور اس طرح ان کے دلوں سے اسلامی اقدار اور روایات کی عقیدت آہستہ آہستہ ختم ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی پورا التزام کیا گیا کہ اُن لوگوں کے نام اور کام کو زیادہ سے زیادہ اچھالا جائے جنہوں نے عالمِ اسلام میں سے کسی ملک کو بھی لادینیت کی راہ پر لگایا ہو۔ چنانچہ ترکی کے ایک شخص ضیاء کوک الپ کے افکار کی دل و جان سے تائید کی گئی، اُس کے طرزِ فکر کو بڑے جاذب اور قابلِ رشک انداز میں سراہا گیا اور اُسے جدید ترکی کا نظریاتی اور فکری موسس ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔

یہ تھیں مختصراً اُس کلوکیم کی کارگذاریاں جو امریکہ میں لاکھوں ڈالر کے صرف سے منعقد ہُوا تھا۔ اس وجہ سے اگر پاکستان کے مسلمانوں کے دلوں میں لاہور کے کلوکیم کی تجویز سن کر کچھ خدشات پیدا ہوئے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ بے وجہ نہ تھے۔

ان خدشات و خطرات کو یہاں کے حالات سے مزید تقویت حاصل ہوئی۔ اس مجلسِ مذاکرہ کے انتظام میں زیادہ تر وہی لوگ دخیل تھے جو مغرب، اُس کی اقدارِ حیات، اُس کے افکار و تصورات، اُس کی طرزِ معاشرت، اور تہذیب و تمدن سے نہ صرف مرعوب ہیں بلکہ مغلوب بھی ہیں۔ ان حضرات

کے خیالات کچھ ڈھکے چھپے نہیں کہ ملک کے باشندے ان سے ناواقف ہوں۔ ان کی "تجدد پسندانہ" کوششیں سب لوگوں کے سامنے ہیں۔ اس لیے اس ملک کے عوام یہ سوچنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ یہ لوگ جس مجلسِ مذاکرہ کو ترتیب دے رہے ہیں اُس میں یہ اور ان کے مغربی رفقاء مل جل کر اسلام اور مسلمانوں کے لیے کچھ نئے فتنے کھڑے کریں گے۔

پھر ان حضرات نے شروع ہی سے جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ بڑا غیر دانشمندانہ تھا۔ انہوں نے اس کلوکیم میں بہت سے ایسے لوگوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جو اسلام پر اتھارٹی کے ساتھ گفتگو کرنے کے اہل ہیں اور ان کی جگہ اُن لوگوں کو مدعو کیا گیا جو اسلام کے علم سے کورے اور اپنے گمراہ کن نظریات کی وجہ سے مسلم قوم میں اچھے خاصے بدنام ہیں۔ اگرچہ کلوکیم کمیٹی کے ایک دو صحیح الخیال ارکان نے انہیں اس غلطی سے روکنے کی کوشش کی، اور انہیں اسلام کے صحیح نمائندوں کو بلانے کا مشورہ دیا، مگر اختیارات جن کے ہاتھ میں تھے وہ اپنی اسکیم بدلنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان کے پیشِ نظر تو یہ مظاہرہ کرنا تھا کہ پاکستان کے اندر بھی اور باہر بھی دنیا بھر کے منکرینِ اسلام کا ایک نیا ایڈیشن تیار کرنے پر متفق ہیں۔

یہی چیز مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے کم نہ تھی کہ اس پر ایک اور حماقت یہ کی گئی کہ چودھری ظفر اللہ خاں کو بھی مجلسِ مذاکرہ میں شرکت کی دعوت دے دی گئی۔ اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہ رہا کہ اس مجلس کے حق میں عام لوگوں کے اندر کسی حسنِ ظن کی گنجائش باقی رہ جاتی۔

کلوکیم کے افتتاح کے موقع پر صدر ریاست نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ عام مسلمانوں کے لیے مزید غم و غصے کے محرک ثابت ہوئے۔ صاحبِ صدر نے تجدد پسندوں کا وہی پرانا ہتھکنڈا استعمال کیا جو اس مشرب کے لوگوں کا چلتا ہوا داؤں ہے کہ ایک طرف اسلام کی "ترقی پسندی" کو خوب ڈل کھول کر داد تحسین دی جائے اور دوسری طرف اُس "ملّا" کو آڑے ہاتھوں لیا جائے جو اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کرنے میں سب سے بڑی مانع قوت ہے۔ یہ تھڑدلے لوگ سامنے آکر خدا اور رسول کی تعلیمات کے خلاف کچھ کہنے کی تو جرأت نہیں رکھتے البتہ اپنے دل کی بھڑاس علماء کو ہدف بنا کر وقتاً فوقتاً نکالتے

رہتے ہیں۔ وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے یہی لوگ اصل وجۂ مصیبت ہیں، حالانکہ اسلام آج جتنا کچھ بھی باقی ہے انہی علمار کی کوششوں، قربانیوں اور محنتوں سے باقی ہے، ورنہ غیر ملکی سامراج کے آگے جو لوگ نقد دل وجان ہار چکے تھے، اور جنہوں نے اپنی دنیا بنانے کے لیے مغربی آقاؤں کی چاکری ہی نہیں ذہنی غلامی تک قبول کر لی تھی ان کے ہاتھوں دین کا جنازہ کبھی کا اٹھ چکا ہوتا۔ یہ بات تو ایک معمولی عقل کا انسان بھی سوچ سکتا ہے کہ دین اگر اس سرزمین میں باقی رہا ہے تو ان لوگوں کی بدولت رہا ہے جنہوں نے مسجدیں آباد رکھیں، جو قرآن اور حدیث پڑھتے پڑھاتے رہے، جن کی زبانیں خدا اور رسول کے ذکر میں شب و روز مشغول رہیں، نہ کہ ان لوگوں کی بدولت جنہیں کبھی جمعہ کی نمازوں تک میں نہ دیکھا گیا، جن کے گھر میں جانماز تک نہیں پائی جاتی، بلکہ جن کے گھروں میں کوئی یہ بتانے والا تک نہیں ملتا کہ سمتِ قبلہ کدھر ہے۔ اس قسم کے لوگ جب اسلام کی ترقی پسندی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے ساتھ مُلّا پر برستے ہیں تو عام مسلمان لازماً اس سے یہ اثر لیتے ہیں کہ شاید یہ حضرات کچھ اسی طرح کا ایک نیا اسلام بنانا چاہتے ہیں جس کی شان ان کی اپنی زندگیوں میں نظر آتی ہے، اور مُلّا پر یہ سارا غصہ اس لیے آرہا ہے کہ یہ کم بخت اس راستے میں حائل ہے۔

صدرِ محترم کی بات اس وجہ سے اور بھی عام مسلمانوں کو ناگوار گزری کہ اسی موقع پر نہیں، اکثر مواقع پہ جب وہ مُلّا پر برستے ہیں تو "مجتہد" اور "ذاکر" حضرات کو بھول جاتے ہیں۔ ان کی زبان سے آج تک کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ اس مذہبی طبقے کا بھی قصور ہے یا نہیں۔

مجلسِ مذاکرہ میں توقع کے عین مطابق بعض مقالات ایسے بھی سننے میں آئے جو انتہائی گمراہ کن اور غلط تھے۔ مثلاً بعض "روشن خیال" مفکرین نے یہ کہا کہ اسلام نے ریاست کا کوئی خاکہ پیش نہیں کیا۔ کسی نے کہا کہ کتاب و سنت میں ایک مملکت کے آئین اور قانون کا کوئی واضح تصور نہیں ملتا۔ کسی نے اسلام کے معاشی نظام کی قریب قریب وہی تصویر پیش کی جو کمیونزم کے معاشی نظام کی ہے۔ ایک اور صاحب نے تو کمال ہی کر دیا۔ انہوں نے دعویٰ فرمایا کہ اسلام صرف خدا پر ایمان اور یوم آخرت کے اقرار کا نام ہے—

جو شخص بھی ان دو بنیادوں کو تسلیم کرلے وہ مومن و مسلم ہے۔ گویا رسالت اور کتب الٰہی اور فرشتوں پر ایمان کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ رواداری اور وسعتِ قلب واقعی بڑی اہم انسانی صفات ہیں اور انسان کو ان کی قدر کرنی چاہیے۔ لیکن جو رواداری ایک ملت کی ایمانی بنیادوں ہی کو ڈھا دے، وہ رواداری نہیں سراسر خودکشی ہے اور کوئی ہوشمند آدمی اس چیز کو اختیار نہیں کر سکتا۔ معلوم نہیں کہ یہ صاحب کس اسلام کا ذکر فرما رہے تھے۔ اگر ان کی مراد اس اسلام سے ہے جو قرآن میں پایا جاتا ہے تو انہوں نے جو کچھ کہا قطعاً قرآن کے خلاف کہا اور اسلام کی بالکل جھوٹی ترجمانی کی۔ اس اسلام کی رُو سے کوئی شخص ہرگز مومن نہیں ہو سکتا، نہ نجات کا مستحق ہو سکتا ہے جب تک وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن مجید پر ایمان نہ لائے۔ ان کو نہ ماننے والا چاہے خدا اور آخرت کو مانتا ہو پھر بھی یقیناً کافر ہے اور اس کا خدا و آخرت کو ماننا کسی طرح بھی نجات کے لیے مفید نہیں ہے۔ اس معاملہ میں سورۂ بقرہ کی آیت اِنَّ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ الخ سے جو استدلال اس سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کر چکے ہیں اور اب خلیفہ عبدالحکیم صاحب کر رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ قرآن کے نازل کرنے والے نے اپنی کوئی آیت دوسری آیات کی تردید و تکذیب کے لیے نازل نہیں کی ہے۔ اس لیے ایک آیت کا وہی مطلب لینا صحیح ہو سکتا ہے جو قرآن کے دوسرے ارشادات سے مطابقت رکھتا ہو، نہ کہ ان کے خلاف پڑتا ہو۔ قرآن کھولتے ہی سب سے پہلے جو آیات انسان کو ملتی ہیں انہی میں یہ صراحت موجود ہے کہ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، یعنی راہِ راست پر وہی ہیں اور فلاح صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جو اس کتاب پر ایمان لائیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اور ان کتابوں پر جو ان سے پہلے نازل ہوئی تھیں اور آخرت پر۔ اس کے بغیر نہ کوئی راہِ راست پر ہو سکتا ہے نہ فلاح پا سکتا ہے۔ اس کے بعد قرآن صاف کہتا ہے کہ جو لوگ ان حقیقتوں کو تسلیم نہیں کرتے ان پر ہدایت کی راہ قطعاً بند ہو جاتی ہے، ان کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ تعالیٰ مہر کر دیتا ہے، اور ان کے لیے عذاب الیم ہے۔ پھر جگہ جگہ قرآن

صاف صاف کہتا ہے کہ:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ...... قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران - ۳۱-۳۲)

کہہ دو (اے محمدؐ!) کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کریگا .... کہو کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی۔ پھر اگر وہ اس سے باز رہیں تو بے شک اللہ کافروں سے تو محبت نہیں کرتا۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء - ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اُسی نے اللہ کی اطاعت کی۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ ... وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (الاعراف - ۱۵۷)

جو لوگ اس رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں .... اور جنہوں نے اُس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اترا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء - ۶۵)

پس نہیں تمہارے رب کی قسم (اے محمدؐ!) وہ مومن نہیں ہیں جب تک کہ ان تمام جھگڑوں میں جو ان کے درمیان واقع ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں کے اندر کوئی تنگی بھی نہ محسوس کریں بلکہ (تمہارے فیصلے کو) سربسر تسلیم کریں۔

قرآن حکیم کی ان تصریحات کے بعد اگر کوئی شخص ایمان کی بنیاد محض توحید باری تعالیٰ اور آخرت کو قرار دیتا ہے اور رسالت سے صرفِ نظر کر لیتا ہے تو وہ دینِ حق کے ساتھ نہایت شرمناک مذاق کرتا ہے۔ وحدتِ ادیان کا یہ فتنہ بڑا ہی خطرناک ہے۔ اس کے پنپنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے

کہ اسلام، عیسائیت، یہودیت، ہندومت، بودھ مت سب یکساں ذریعۂ نجات اور مذہبِ حق قرار پا جائیں۔ اس کے بعد اسلام کی طرف دنیا کو دعوت دینے کے سرے سے کوئی معنی ہی باقی نہیں رہتے۔ افسوس ہے کہ پاکستان میں یہ فتنہ سرکاری سرپرستی میں سر اٹھا رہا ہے اور اس کی تبلیغ کرنے والے بزرگ ہمارے قومی خزانے سے اس کے لیے مدد پا رہے ہیں۔

اس مجلسِ مذاکرہ کا انتظام و انصرام جن ہاتھوں میں تھا انہوں نے بھی نہایت گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کیا۔ ایک تو انہوں نے اس کلوکیم میں بعض ایسے مقالات پڑھنے کی اجازت دے دی جو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متصادم تھے۔ دوسرے انہوں نے محض دوستی اور دھڑے بندی کی وجہ سے ایسے لوگوں کو بھی مدعو کیا جن کی اسلام شناسی کا یہ حال تھا کہ وہ قرآنِ پاک کی آیات تک صحیح نہ پڑھ سکتے تھے۔ اس سے نہ صرف غیر مسلموں کو اسلام کی تضحیک کا موقع ملا بلکہ پاکستان کا وقار بھی سخت مجروح ہوا۔ تیسرے ان حضرات نے جو روش صحیح اسلامی ذہن رکھنے والے اہلِ علم کے ساتھ اختیار کی وہ سخت ناپسندیدہ تھی۔ تجدّد پسند اصحاب جو "رطب و یابس" کہنا چاہتے انہیں پورا پورا موقع بہم پہنچایا جاتا اور جب کوئی اللہ کا بندہ ان کے گمراہ کن افکار پر تنقید کے لیے اجازت طلب کرتا تو اس کے راستے میں مختلف قسم کی مزاحمتیں پیش کی جاتیں۔ کبھی اسے یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ وقت کی گنجائش نہیں اور کبھی بجلی اور لاؤڈ سپیکر بند کر دینے میں بھی کوئی شرم محسوس نہ کی گئی۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے حربے ہر اس شخص کی زبان بندی کے لیے اختیار کیے گئے جس نے ان باطل افکار پر ذرا سختی سے گرفت کی۔

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی کوئی کم افسوسناک نہیں کہ حکومت نے اس کلوکیم کے لیے زرِ کثیر عطا کیا تھا لیکن اس مجلسِ مذاکرہ کے انتظامات حد درجہ ناقص تھے۔ سامعین کے لیے اس قدر کم گنجائش تھی کہ بے شمار لوگ ہال میں داخل نہ ہو سکتے اور بے نیلِ مرام واپس لوٹ جاتے۔ اس

مجلسِ مذاکرہ میں عالمِ اسلام کی بعض مقتدر شخصیتیں موجود تھیں۔ یہاں کے لوگوں میں ان سے ملنے کے لیے ایک تڑپ کا موجود ہونا ایک بالکل فطری امر تھا مگر مجلس مذاکرہ کے اربابِ اختیار اور اُن کے ناتراشیدہ کارکنان ہمیشہ اُن کے راستے میں حائل رہے اور ان مندوبین پر اس طرح کے پہرے لگائے رکھے جیسے کہ وہ ان لوگوں کی حراست میں ہیں۔ اس کے علاوہ مقالات کے تراجم نامکمل اور حد درجہ ناقص تھے۔ جب ان حضرات کے پاس اتنی وافر رقم موجود تھی تو ان کا فرض تھا کہ وہ ان مقالات کے ترجمے اور طباعت کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر انتظام کرتے اور تمام مقالات کے تراجم اردو، عربی، انگریزی تینوں زبانوں میں، جو کلوکیم کی سرکاری زبانیں تسلیم کی گئی تھیں، نہایت بلند معیار پر شائع کر کے انہیں بڑے التزام کے ساتھ مندوبین اور دوسرے لوگوں میں تقسیم کرتے مگر افسوس کہ ان بنیادی کاموں میں سے کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہ کیا گیا اور رقم کا بیشتر حصہ آرائش، زیبائش، دعوتوں اور اسی قسم کے نمائشی کاموں پر صرف ہوا۔ ان تراجم کو دیکھ کر یہ چلتا ہے کہ محمد اسد صاحب کی شکایات بالکل بجا تھیں اور یہ لوگ اُس معیار کو قائم نہیں رکھ سکے جس کی مجلسِ مذاکرہ متقاضی تھی اور جس کی یقین دہانی اسد صاحب کا استعفا قبول کرتے وقت بار بار کرائی گئی تھی۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتیں بھی عجیب و غریب ہیں۔ وہی ذات پاک ہر کام میں اپنی مخصوص مصلحتوں کو جانتی ہے۔ اُس کے انداز نرالے ہیں اور انسان کا ناقص ذہن اُن کو سمجھنے سے بسا اوقات قاصر ہوتا ہے۔ اُس کی حکمت بالغہ اکثر اوقات اُن چیزوں میں بھی لاتعداد پہلو خیر کے پیدا کر دیتی ہے جن میں بظاہر کسی بھلائی کے آثار نظر نہیں آتے۔ اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز میں سراسر بھلائی دیکھتے ہیں مگر وہ نتائج کے اعتبار سے یکسر برائی ہوتی ہے۔

عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ	شاید تمہیں ایک چیز بری معلوم ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں ایک چیز

شَرٌّ لَّكُمْ ۔ (البقرہ) بھلی معلوم ہو اور وہ تمہارے حق میں بُری ہو۔

عُدو شر برانگیزد کہ خیرِ ما درآں باشد' والا معاملہ اس اسلامی مجلسِ مذاکرہ کا بھی ہوا۔ اس کی ظاہری شکل و صورت تو یہ تھی کہ اس میں غالب اکثریت غیر مسلم مستشرقین اور تجدد پسند و آزاد خیال مسلمانوں کی تھی اور ان میں ایسے لوگ بہت تھوڑی تعداد میں تھے جن کو صحیح معنوں میں علمائے اسلام کہا جا سکتا ہو۔ اس انتظام سے امیدیں یہی کچھ وابستہ کی جا سکتی تھیں کہ یہاں بین الاقوامی پیمانے پر اسلام کا ایک نیا ایڈیشن اچھی طرح تیار ہو سکے گا اور اس میں "ملا" کی آواز دب کر رہ جائیگی۔ ایسی ہی کچھ امیدوں کی نشان دہی صدر محترم کا افتتاحی خطبہ کر رہا تھا۔ پھر ایک غلط فہمی یہ بھی تھی کہ صرف پاکستان کے علماء ہی "تنگ نظر" اور "تاریک خیال" ہیں اور اس بنا پر مغربی اقدار کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ دوسرے اسلامی ممالک کے اہلِ علم کا یہ حال نہیں ہے وہ اپنے افکار و تصورات، اپنے نظریات و معتقدات کے اعتبار سے بالکل "ماڈرن اور ترقی پسند" ہیں۔ اس لیے جب اسلام کا جدید ایڈیشن اُن کے سامنے پیش کیا جائے گا تو نہ صرف پوری گرم جوشی سے اس کا استقبال ہو گا بلکہ یہ لوگ اس کے جاں نثار فدائی اور پُر جوش مبلغ بن کر جائیں گے اور پھر اپنی حیات ہائے مستعار کے بقیہ لمحات اسی کی تبلیغ اور اشاعت میں صرف کریں گے۔ اس طرح پاکستان کے تجدد پسند اصحاب کو ایک طرف دنیائے اسلام کی قیادت اور رہنمائی کا منصب خود بخود حاصل ہو جائے گا اور دوسری طرف اہلِ پاکستان پر بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ یہ "دقیانوسی ملّا" جو چودہ سو سال پہلے کا پرانا اسلام تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے اور تمہیں اس کے اتباع کی ہر وقت نصیحت کرتا ہے اسے تو سارے اسلامی ممالک بھی ترک کر چکے ہیں، آخر تم اس "نعش" کو کیوں اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہو، کیوں نہیں اسے دفن کر دیتے اور اس کی جگہ اُس اسلام کو قبول کر لیتے جو دانائے فرنگ اور اس کے مقلدین نے تمہارے لیے اختیار کیا ہے؟

مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی حکمتِ بالغہ سے نتائج اس کے بالکل برعکس برآمد ہوئے۔

اس مجلس نے ایک بار اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے کہ امتِ مسلمہ بحیثیت امت اسلام کی کسی ایسی تعبیر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی جو ماضی سے بغاوت پر مبنی ہو وہ اگرچہ انحطاط میں مبتلا ہے لیکن دین کے معاملے میں اس کی حس ابھی تک بالکل صحیح اور درست ہے اور اس کا ضمیر ہر اُس چیز سے ابا کرتا ہے جس سے دین کو نقصان پہنچے۔ اُسے اپنے اسلاف سے گوناگوں محبت اور عقیدت ہے اور اُن کے علمی کارناموں کو وہ نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے، انہیں دریا برد کر دینے پر وہ کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔ اس کی نظر میں آج بھی اصل معیارِ انسانیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہی ہے اور جس چیز کے بارے میں اُسے یقین ہو جائے کہ وہ حضور کی طرف سے پہنچی ہے اُسے قبول کرنے ہی میں وہ اپنی اور پوری نوع انسانی کی نجات سمجھتی ہے۔ اُس کا ایمان اُسی دین پر ہے جو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور جس کے بہترین نمونے حضور کے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین تھے۔ قرآن مجید کی وہی تعبیر اُس کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہے جس کی تائید سنتِ رسول اور آثارِ صحابہ سے ہوتی ہو۔ دین میں جس طرح قرآن حکیم کے احکام حجت ہیں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ ثابتہ بھی حجت ہے اور اگر کوئی شخص سنت کو چھوڑ کر صرف قرآنِ حکیم کو ماخذِ دین ٹھیراتا ہے تو وہ گمراہ ہے۔

جن حضرات کو کلولمبو میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ پاکستان کے سوا کسی اسلامی ملک کا کوئی نمائندہ ایسا نہ تھا جس نے اسلام کے بارے میں ان بدیہی حقائق کا اعتراف نہ کیا ہو۔ اس معاملے میں باہر کے مسلم نمائندوں کے احساسات تو یہاں تک نازک تھے کہ وہ کوئی ایسی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے جو قرآن و سنت کی مسلم تعلیمات کے خلاف ہوتی تھی، یا جس میں دین کی شکل بگاڑنے کی کوئی جھلک پائی جاتی تھی، حالانکہ وہ بھی اکثر و بیشتر ہمارے پاکستانی نمائندوں کی طرح مغربی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے بلکہ اس معاملہ میں ان سے چند قدم آگے ہی تھے۔ ان سب حضرات نے مختلف ممالک کے نمائندے ہونے کے باوجود

جس وحدتِ فکر کا ثبوت دیا وہ اہلِ پاکستان کے لیے باعثِ رشک ہے۔ پاکستان کے چند آزاد خیال لوگوں کی رائے سن کر انہیں سخت تعجب ہوا اور اُن کے لیے یہ باور تک کرنا محال تھا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلائے اور پھر اس قسم کے خلافِ اسلام خیالات کا اظہار بھی کرے۔
اس معاملے میں خوشی کے ساتھ غم و افسوس کا پہلو اگر کوئی ہے تو یہ کہ ساری دنیا ئے اسلام میں صرف پاکستان ہی تھا جس کی طرف سے یہ بدنما مظاہرہ کیا گیا۔ دوسرے مسلمان ملکوں کے پاس ملاحدہ اور تجدد پسندوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ چاہتے تو اپنے ہاں سے بھی ایسے نمائندے بھیج سکتے تھے۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی دنیا بھر کے سامنے اپنی بُری نمائندگی پیش کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شامی اور مصری علماء کے مقالات کو دیکھنے سے ہمیں ایک اور خوشی اس بات کی ہوئی ہے کہ اُن کا اسلام کے متعلق زاویۂ نگاہ ہمارے ہاں کے بہت سے روشن خیال اصحاب کی طرح اعتذار پسندانہ نہیں۔ انہیں اسلامی تعلیمات پر پورا پورا ایمان اور یقین ہے اور وہ پورے وثوق سے یہ کہتے ہیں کہ خالص اسلام ہی دنیا کے دکھوں کا مداوا اور علاج ہے۔ وہ اسلامی اور غیر اسلامی اقدار کو ملا کر ایک ملغوبہ تیار کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ اسلام کو ایک ہمہ گیر، اور باطل شکن تحریکِ فکر و عمل سمجھتے ہیں اور اس بات کی پوری توقع رکھتے ہیں کہ اس تحریک کو اب اس دنیا میں ایک غالب قوت کی حیثیت سے سربلند ہونا ہے، دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کا راستہ روک سکے۔ اُن کا دین کے بارے میں تصور وہی ہے جس کا دین ہم سے تقاضا کرتا ہے۔ وہ دین کو خالق و مخلوق کے درمیان ایک پرائیویٹ رشتہ نہیں سمجھتے بلکہ ایک ایسا نظامِ حیات خیال کرتے ہیں جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہو۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق یہ دین انسانیت کو رہنمائی نہ دیتا ہو۔

اسلامی ممالک کے مندوبین کے یہ احساسات و خیالات ایک روشن مستقبل کی نشاندہی کرتے

ہیں۔ ان سب حضرات کی اسلام سے وابستگی، قلبی تعلق اور جوش کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ اسلام میں پھر سے ایک بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اب ایک ہی جذبہ دنیا کے سارے مسلمانوں کو سرگرمِ عمل کر رہا ہے۔ ایک ہی اذان غلامانِ محمد کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ ان ممالک نے غیر اسلامی طریقوں اور باطل نظاموں کو اپنا کر ان کے مہلک نتائج کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور اب انہیں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ کوئی چیز اگر انہیں اس ہلاکت اور تباہی سے بچا کر مقامِ محمود پر فائز کر سکتی ہے تو وہ صرف اسلام اور تنہا اسلام ہے۔ در بدر کی ٹھوکریں کھا چکنے کے بعد جب بھٹکا ہوا راہی اپنی منزلِ مقصود تلاش کر لیتا ہے تو اس کی خوشی کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس کو کبھی اس قسم کی مصیبت سے گزرنا پڑا ہو۔ قریب قریب اسی قسم کی مسرت اور خوشی کی لہریں عالمِ اسلام سے آئے ہوئے مندوبین کے چہروں پر کھیل رہی تھیں اور وہ مسلمانوں کو یہ پیغام دے رہی تھیں۔

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر پیدا کریں

احیائے اسلام کے لیے ایک شدید تڑپ جو عالمِ اسلام کے سارے نمائندوں کے دل میں موجود تھی وہ اس حقیقت کی آئینہ دار بھی تھی کہ یہ چیز اُن کے دل کی فطری پکار ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو خود اُن کے دل کی گہرائیوں سے اٹھا ہے۔ اس شعلہ کو خود انہیں کے جذبات و احساسات کی حرارت نے بھڑکایا ہے۔ اسے باہر سے کسی نے دیا سلائی نہیں دکھائی۔ سخت احمق ہیں وہ لوگ جو احیائے اسلام کی کوششوں کو کسی غیر ملکی سامراج کی کرشمہ سازی خیال کرتے ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ خارجی اثرات سے دنیائے اسلام کے سارے مسلمانوں پر ایک ہی سی کیفیات طاری ہو جائیں، وہ ایک ہی طرز پر سوچنے لگیں اور ایک ہی تدبیر سے مختلف مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ خیالات و احساسات کی یہ یک جہتی کسی مصنوعی طریقہ سے تو پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یہ اُسی صورت میں معرضِ وجود میں آتی ہے جب داخلی طور پر لوگ ایک ہی طرح محسوس کریں اور یہ احساس ایک ایسی چیز ہے جسے کبھی خارج سے کسی کے اندر داخل نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ انسان کے اپنے دل ہی میں موجزن ہوتا ہے۔ احیاءِ اسلام

کی ان مخلصانہ کوششوں کو کسی سامراج کی طرف منسوب کرنے والے درحقیقت خود کافرانہ نظام حیات کے ایجنٹ ہیں اور وہ ایک مجرم ضمیر انسان کی طرح دوسروں کو ملعون کر کے خود اپنے دل کے اندر چھپے ہوئے چور کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے باطل نظریات کی جس طرح اسلام سے تائید کرانے کی ناکام کوشش کی ہے اُس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس طبقہ کی راہنمائی بعض وہ غیر ملکی طاقتیں کر رہی ہیں جنہیں اسلام سے شدید خطرہ ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کے اندر ذہنی انتشار اور اندرونی خلفشار پیدا کر کے اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روک دیا جائے۔

اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل

اور

اس میں اجتہاد کا مقام

(از سید ابوالاعلیٰ مودودی)

[یہ مقالہ بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ کی ایک نشست میں مورخہ ۳ جنوری ۱۹۵۸ء

کو یونیورسٹی ہال میں پڑھا گیا]

اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل کیا ہے اور اس میں اجتہاد کا کیا مقام ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے دو باتیں واضح طور پر ہماری نگاہ میں رہیں۔

حاکمیتِ الٰہی

اول یہ کہ اسلام میں حاکمیت خالصتہً اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی گئی ہے۔ قرآن عقیدۂ توحید کی جو تشریح کرتا ہے اس کی رو سے خدائے وحدہ لاشریک صرف مذہبی معنوں ہی میں معبود ہی نہیں ہے بلکہ سیاسی اور قانونی مفہوم کے لحاظ سے حاکم مطاع، امر و نہی کا مختار، اور واضع قانون بھی ہے۔ خدا کی اس قانونی حاکمیت (LEGAL SOVEREIGNTY) کو قرآن اتنی ہی وضاحت اور اتنے ہی زور سے پیش کرتا ہے جس کے ساتھ اس نے خدا کی مذہبی معبودیت کا عقیدہ پیش کیا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کی یہ دونوں حیثیتیں اس کی الوہیت کے لازمی تقاضے ہیں جن کو ایک دوسرے سے منفک نہیں کیا جا سکتا، اور ان میں سے جس کا بھی انکار کیا جائے وہ لازماً خدا کی الوہیت کا انکار ہے۔ پھر وہ اس شبہ کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ شاید قانونِ خداوندی سے مراد قانونِ فطرت ہو۔ اس کے برعکس وہ اپنی ساری دعوت ہی اس بنیاد پر اٹھاتا ہے کہ انسان کو اپنی اخلاقی اور اجتماعی زندگی میں خدا کے اس قانونِ شرعی کو تسلیم کرنا چاہیے جو اس نے اپنے انبیاء کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ اسی قانونِ شرعی کو ماننے، اور اس کے مقابلے

میں اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو جانے کا نام وہ "اسلام" (SURRENDER) رکھتا ہے، اور صاف صاف الفاظ میں انسان کے اس حق کا انکار کرتا ہے کہ جن معاملات کا فیصلہ خدا اور اس کے رسول نے کر دیا ہو ان میں وہ خود اپنی رائے سے کوئی فیصلہ کرے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

(الاحزاب: ۳۶)

نبوتِ محمدی

دوسری بات، جو اسلام میں اتنی ہی بنیادی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ توحید الٰہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔ درحقیقت یہی وہ چیز ہے جس کی بدولت توحید الٰہ کا عقیدہ مجرد تخیل سے ایک عملی نظام کی شکل اختیار کرتا ہے، اور اسی پر اسلام کے پورے نظامِ زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اس عقیدے کی رُو سے اللہ تعالیٰ کے تمام سابق انبیاء کی لائی ہوئی تعلیمات، بہت سے اہم اضافوں کے ساتھ، اس تعلیم میں جمع ہو گئی ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، اس لیے خدائی ہدایت اور تشریع کا مستند ماخذ صرف یہی ایک ہے، اور آئندہ کوئی مزید ہدایت اور تشریع آنے والی نہیں ہے جس کی طرف انسان کو رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔ یہی محمدی تعلیم وہ بالاتر قانون (SUPREME LAW) ہے جو حاکم اعلیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ قانون محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو دو شکلوں میں ملا ہے۔ ایک قرآن جو بلفظہ خداوند عالم کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہے۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ، یا آپ کی سنت، جو قرآن کے منشا کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے محض نامہ بر نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہوتا۔ وہ اس کے مقرر کیے ہوئے رہنما، حاکم، اور معلم بھی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اپنے قول اور عمل سے قانونِ الٰہی کی تشریح کریں، اس کا صحیح منشا سمجھائیں، اس کے منشا کے مطابق افراد کی تربیت کریں، پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دے کر معاشرے کی اصلاح کے لیے جدوجہد کریں، پھر اس اصلاح شدہ معاشرے کو

ایک صالح و مصلح ریاست کی صورت دے کر یہ دکھا دیں کہ اسلام کے اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کا یہ پورا کام، جو ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپ نے انجام دیا، وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانونِ برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے، اور اسی قانونِ برتر کا نام اسلامی اصطلاح میں "شریعت" ہے۔

قانون سازی کا دائرۂ عمل

بادی النظر میں ایک آدمی ان بنیادی حقیقتوں کو سن کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس صورت میں تو ایک اسلامی ریاست میں انسانی قانون سازی کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، کیونکہ یہاں تو قانون ساز صرف خدا ہے، اور مسلمانوں کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس پیغمبر کے دیئے ہوئے قانونِ خداوندی کی پیروی کریں۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اسلام قانون سازی کی نفی نہیں کرتا بلکہ اسے خدائی قانون کی بالاتری سے محدود کرتا ہے۔ اس بالاتر قانون کے تحت، اور اس کے قائم کیے ہوئے حدود کے اندر انسانی قانون سازی کا دائرۂ عمل کیا ہے، اس کو میں یہاں مختصر الفاظ میں بیان کروں گا

تعبیر احکام

انسانی زندگی کے معاملات میں سے ایک قسم کے معاملات وہ ہیں جن میں قرآن اور سنت نے کوئی واضح اور قطعی حکم دیا ہے، یا کوئی خاص قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کوئی فقیہ، کوئی قاضی، کوئی قانون ساز ادارہ، شریعت کے دیئے ہوئے حکم یا اس کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کو نہیں بدل سکتا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان میں قانون سازی کے لیے کوئی مجالِ کار ہے ہی نہیں۔ انسانی قانون سازی کا دائرۂ عمل ان معاملات میں یہ ہے کہ سب سے پہلے ٹھیک ٹھیک معلوم کیا جائے کہ حکم فی الواقع ہے کیا، پھر اس کا منشا اور مفہوم متعین کیا جائے اور یہ تحقیق کیا جائے کہ یہ حکم کن حالات اور واقعات کے لیے ہے، پھر عملاً پیش آنے والے مسائل پر ان کے انطباق کی صورتیں اور مجمل احکام کی جزئی تفصیلات طے کی جائیں، اور ان سب امور کے ساتھ یہ بھی مشخص کیا جائے کہ استثنائی حالات و واقعات میں ان احکام و قواعد سے ہٹ کر کام کرنے کی گنجائش کہاں کس حد تک ہے۔

قیاس

دوسری قسم کے معاملات وہ ہیں جن کے بارے میں شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا ہے، مگر ان سے

ملتے جلتے معاملات کے متعلق وہ ایک حکم دیتی ہے۔ اس دائرے میں قانون سازی کا عمل اس طرح ہوگا کہ احکام کی علتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر ان تمام معاملات میں ان کو جاری کیا جائے گا جن میں وہ علتیں فی الواقع پائی جاتی ہوں، اور ان تمام معاملات کو ان سے مستثنیٰ ٹھہرایا جائے گا جن میں درحقیقت وہ علتیں نہ پائی جاتی ہوں۔

استنباط

ایک اور قسم ان معاملات کی ہے جن میں شریعت نے متعین احکام نہیں بلکہ کچھ جامع اصول دیئے ہیں۔ یا شارع کا یہ منشا ظاہر کیا ہے کہ کیا چیز پسندیدہ ہے جیسے فروغ دینا مطلوب ہے، اور کیا چیز ناپسندیدہ ہے جسے مٹانا مطلوب ہے۔ ایسے معاملات میں قانون سازی کا کام یہ ہے کہ شریعت کے ان اصولوں کو اور شارع کے اس منشا کو سمجھا جائے، اور عملی مسائل میں ایسے قوانین بنائے جائیں جو ان اصولوں پر مبنی ہوں اور شارع کے منشا کو پورا کرتے ہوں۔

آزادانہ قانون سازی کا دائرہ

ان کے علاوہ ایک بہت بڑی قسم ان معاملات کی ہے جن کے بارے میں شریعت بالکل خاموش ہے، نہ براہِ راست ان کے متعلق کوئی حکم دیتی ہے اور نہ ان سے ملتے جلتے معاملات ہی کے متعلق کوئی ہدایت اس میں ملتی ہے کہ ان کو اس پر قیاس کیا جاسکے۔ یہ خاموشی خود اس بات کی دلیل ہے کہ حاکم اعلیٰ ان میں انسان کو خود اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا حق دے رہا ہے۔ اس لیے ان میں آزادانہ قانون سازی کی جاسکتی ہے مگر یہ قانون سازی ایسی ہونی چاہیے جو اسلام کی روح اور اس کے اصولِ عامہ سے مطابقت رکھتی ہو، جس کا مزاج اسلام کے مجموعی مزاج سے مختلف نہ ہو، جو اسلامی زندگی کے نظام میں ٹھیک ٹھیک نصب ہوسکتی ہو۔

اجتہاد

قانون سازی کا یہ سارا عمل، جو اسلام کے قانونی نظام کو متحرک بناتا اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اس کو نشوونما دیتا چلا جاتا ہے، ایک خاص علمی تحقیق اور عقلی کاوش ہی کے ذریعے سے انجام پاسکتا ہے، اور اسی کا نام اسلامی اصطلاح میں اجتہاد ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی تو ہیں کسی کام کی انجام دہی میں انتہائی کوشش صرف کرنا۔ مگر اصطلاحاً اس سے مراد ہے یہ معلوم

کرنے کی انتہائی کوشش کہ ایک مسئلۂ زیر بحث میں اسلام کا حکم یا اس کا منشا کیا ہے" بعض لوگ غلطی سے اجتہاد کو بالکل آزادانہ استعمال رائے کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسا شخص جو اسلامی قانون کی نوعیت سے واقف ہو، اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ اس طرح کے ایک قانونی نظام میں کسی آزاد اجتہاد کی بھی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے۔ یہاں تو اصل قانون قرآن و سنت ہے۔ انسان جو قانون سازی کر سکتے ہیں وہ لازماً یا تو اس اصل قانون سے ماخوذ ہونی چاہیے، یا پھر ان حدود کے اندر ہونی چاہیے جن میں وہ استعمال رائے کی آزادی دیتا ہے۔ اس سے بے نیاز ہو کر جو اجتہاد کیا جائے وہ نہ اسلامی اجتہاد ہے اور نہ اسلام کے قانونی نظام میں اس کے لیے کوئی جگہ ہے۔

اجتہاد کے لیے ضروری اوصاف

اجتہاد کا مقصد چونکہ خدائی قانون کو انسانی قانون سے بدلنا نہیں بلکہ اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور اس کی رہنمائی میں اسلام کے قانونی نظام کو زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ متحرک کرنا ہے، اس لیے کوئی صحت مندانہ اجتہاد اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے قانون سازوں میں حسبِ ذیل اوصاف موجود ہوں:

(۱) شریعت الٰہی پر ایمان، اس کے برحق ہونے کا یقین، اس کے اتباع کا مخلصانہ ارادہ، اس سے آزاد ہونے کی خواہش کا معدوم ہونا اور مقاصد، اصول اور اقدار کسی دوسرے ماخذ سے لینے کے بجائے صرف خدا کی شریعت سے لینا۔

(۲) عربی زبان اور اس کے قواعد اور ادب سے اچھی واقفیت، کیونکہ قرآن اسی زبان میں نازل ہوا ہے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع بھی اسی زبان میں ہیں۔

(۳) قرآن اور سنت کا علم جس سے آدمی نہ صرف جزوی احکام اور ان کے مواقع سے واقف ہو، بلکہ شریعت کے کلیات اور اس کے مقاصد کو بھی اچھی طرح سمجھ لے۔ اس کو ایک طرف یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسانی زندگی کی اصلاح کے لیے شریعت کی مجموعی اسکیم کیا ہے اور دوسری طرف یہ جاننا چاہیے کہ اس مجموعی اسکیم میں زندگی کے ہر شعبے کا کیا مقام ہے، شریعت اس کی تشکیل کن خطوط پر کرنا چاہتی ہے اور اس تشکیل میں اس کے پیش نظر کیا مصالح ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اجتہاد کے لیے

قرآن و سنت کا وہ علم درکار ہے جو مغزِ شریعت تک پہنچتا ہو۔

(۴) پچھلے مجتہدینِ امت کے کام سے واقفیت، جس کی ضرورت صرف اجتہاد کی تربیت ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ قانونی ارتقاء کے تسلسل (CONTINUITY) کے لیے بھی ہے۔ اجتہاد کا مقصد بہرحال یہ نہیں ہے اور نہیں ہونا چاہیے کہ ہر نسل پچھلی نسلوں کی چھوڑی ہوئی تعمیر کو ڈھا کر یا متروک قرار دے کر نئے سرے سے تعمیر شروع کرے۔

(۵) عملی زندگی کے حالات و مسائل سے واقفیت، کیونکہ انہی پر شریعت کے احکام اور اصول و قواعد کو منطبق کرنا مطلوب ہے

(۶) اسلامی معیارِ اخلاق کے لحاظ سے عمدہ سیرت و کردار، کیونکہ اس کے بغیر کسی اجتہاد پر لوگوں کا اعتماد نہیں ہو سکتا اور نہ اُس قانون کے لیے عوام میں کوئی جذبۂ احترام پیدا ہو سکتا ہے جو غیر صالح لوگوں کے اجتہاد سے بنا ہو۔

اِن اوصاف کے بیان سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ہر اجتہاد کرنے والے کو پہلے یہ ثبوت پیش کرنا چاہیے کہ اس میں یہ اوصاف موجود ہیں۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ اجتہاد کے ذریعے سے اسلامی قانون کا نشوونما اگر صحیح خطوط پر ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں، جب کہ قانونی تعلیم و تربیت کا نظام ایسے اوصاف کے اہلِ علم تیار کرنے لگے۔ اس کے بغیر جو قانون سازی کی جائے گی وہ نہ اسلامی قانون کے نظام میں جذب ہو سکے گی اور نہ مسلم سوسائٹی اس کو ایک خوشگوار غذا کی طرح ہضم کر سکے گی۔

اجتہاد کا صحیح طریقہ

اجتہاد، اور اس کی بنا پر ہونے والی قانون سازی کے مقبول ہونے کا انحصار جس طرح اس بات پر ہے کہ اجتہاد کرنے والوں میں اس کی اہلیت ہو، اسی طرح اس امر پر بھی ہے کہ یہ اجتہاد صحیح طریقے سے کیا جائے۔ مجتہد خواہ تعبیرِ احکام کر رہا ہو یا قیاس و استنباط، بہرحال اسے اپنے استدلال کی بنیاد قرآن اور سنت ہی پر رکھنی چاہیے۔ بلکہ مباحات کے دائرے میں آزادانہ قانون سازی کرتے ہوئے بھی اسے اس بات پر دلیل لانی چاہیے کہ قرآن و

سنت نے واقعی فلاں معاملے میں کوئی حکم یا قاعدہ مقرر نہیں کیا ہے اور نہ قیاس ہی کے لیے کوئی بنیاد فراہم کی ہے۔ پھر قرآن و سنت سے جو استدلال کیا جائے وہ لازماً اُن طریقوں پر ہونا چاہیے جو اہلِ علم میں مسلم ہیں۔ قرآن سے استدلال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک آیت کے وہ معنی لیے جائیں جن کے لیے عربی زبان کی لغت، قواعد اور معروف استعمالات میں گنجائش ہو، جو قرآن کی عبارت کے سیاق و سباق سے لگتے ہوئے ہوں، جو اسی موضوع کے متعلق قرآن کے دوسرے بیانات سے متناقض نہ ہوں، اور جن کی تائید سنت کی قولی اور عملی تشریحات سے بھی ملتی ہو، یا کم از کم یہ کہ سنت ان معنوں کے خلاف نہ ہو۔ سنت سے استدلال کرنے میں زبان اور اس کے قواعد اور سیاق و سباق کی رعایت کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن روایات سے کسی مسئلے میں سند لائی جا رہی ہو وہ قواعد علم روایت کے لحاظ سے معتبر ہوں، اس موضوع سے متعلق دوسری معتبر روایات کو بھی نگاہ میں رکھا گیا ہو، اور کسی ایک روایت سے کوئی ایسا نتیجہ نہ نکال لیا گیا ہو جو مستند ذرائع سے ثابت شدہ سنت کے خلاف پڑتا ہو۔ ان احتیاطوں کو ملحوظ رکھے بغیر من مانی تاویلات سے جو اجتہاد کیا جائے اسے اگر سیاسی قوت کے بل پر قانون کا مرتبہ دے بھی دیا جائے تو نہ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر اس کو قبول کر سکتا ہے اور نہ وہ حقیقتہً اسلامی نظام قانون کا جز بن سکتا ہے۔ جو سیاسی قوت اسے نافذ کرے گی اس کے ہٹتے ہی اس کا قانون بھی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائیگا۔

اجتہاد کو قانون کا مرتبہ کیسے حاصل ہوتا ہے

کسی اجتہاد کو قانون کا مرتبہ حاصل ہونے کی متعدد صورتیں اسلامی نظام قانون میں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ تمام امت کے اہلِ علم کا اس پر اجماع ہو۔ دوسری یہ کہ کسی شخص یا گروہ کے اجتہاد کو قبول عام حاصل ہو جائے اور لوگ خود بخود اس کی پیروی شروع کر دیں، جس طرح مثلاً فقہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیوں نے قانون [illegible] تیسری یہ کہ کسی اجتہاد کو کوئی مسلم حکومت اپنا قانون قرار دے لے، جیسے [illegible] فقہ حنفی کو اپنا قانون ملکی قرار دیا تھا۔ چوتھی یہ کہ ریاست میں ایک ادارہ دستوری حیثیت سے قانون سازی کا مجاز ہو اور وہ اجتہاد سے کوئی قانون بنائے

ان صورتوں کے ماسوا جتنے اجتہادات مختلف اہلِ علم کریں ان کا مرتبہ فتوے سے زیادہ نہیں ہے۔ رہے قاضیوں کے فیصلے، تو وہ ان خاص مقدمات میں تو ضرور قانون کے طور پر نافذ ہوتے ہیں جن میں وہ کسی عدالت نے کیے ہوں، اور انہیں نظائر (PRECEDENTS) کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے، لیکن صحیح معنوں میں وہ قانون نہیں ہوتے، حتیٰ کہ خلفائے راشدین کے بھی وہ فیصلے اسلام میں قانون نہیں قرار پائے جو انھوں نے قاضی کی حیثیت سے کیے تھے۔ اسلامی نظامِ قانون میں قضاۃ کے بنائے ہوئے قانون (JUDGE MADE LAW) کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا

"اِستدراک"

[اس مقالہ پر ایک "تجدد پسند" صاحب نے بعض اعتراضات کیے۔ جن کے جوابات تحریری طور پر لکھ کر مجلسِ مذاکرہ کے ناظم کو بھیج دیئے گئے۔ اب انہیں مقالہ کے ساتھ ہی افادہ عام کے لیے درج کیا جاتا۔]

اسلام میں قانون سازی اور اجتہاد کے موضوع پر میرے مقالے کے سلسلے میں جو اعتراضات کیے گئے ہیں، میں یہاں ان کا جواب زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ دینے کی کوشش کروں گا۔

پہلا اعتراض اُس پوزیشن پر ہے جو قرآن کے ساتھ سنت کو دی گئی ہے۔ اس کے جواب میں چند باتیں میں ترتیب وار عرض کروں گا تاکہ مسئلہ پوری طرح آپ کے سامنے واضح ہو جائے۔

(۱) یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن پہنچا دینے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک ہمہ گیر تحریک کی رہنمائی بھی کی تھی جس کے نتیجے میں ایک مسلم سوسائٹی پیدا ہوئی، ایک نیا نظام تہذیب و تمدن وجود میں آیا اور ایک ریاست قائم ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پہنچانے کے سوا یہ دوسرے کام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے، یہ آخر کس حیثیت سے تھے؟ آیا یہ نبی کی حیثیت سے تھے جن میں

آپ اسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن ؟ یا آپ کی پیغمبرانہ حیثیت قرآن سنا دینے کے بعد ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد آپ عام مسلمانوں کی طرح محض ایک مسلمان رہ جاتے تھے جس کا قول و فعل اپنے اندر بجائے خود کوئی قانونی سند و حجت نہیں رکھتا۔ پہلی بات تسلیم کی جائے تو سنت کو قرآن کے ساتھ قانونی سند و حجت ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ البتہ دوسری صورت میں اسے قانون قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

(۲) جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف نامہ بر نہیں تھے، بلکہ خدا کی طرف سے مقرر کیے ہوئے رہبر، حاکم اور معلم بھی تھے جن کی پیروی و اطاعت مسلمانوں پر لازم تھی اور جن کی زندگی کو تمام اہلِ ایمان کے لیے نمونہ قرار دیا گیا تھا جہاں تک عقل کا تعلق ہے، وہ یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ ایک نبی صرف خدا کا کلام پڑھ کر سنا دینے کی حد تک تو نبی ہو، اور اس کے بعد وہ محض ایک عام آدمی رہ جائے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ آغازِ اسلام سے آج تک بالاتفاق ہر زمانے میں اور تمام دنیا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نمونہ واجب الاتباع اور ان کے امر و نہی کو واجب الاطاعت مانتے رہے ہیں، حتیٰ کہ کوئی غیر مسلم عالم بھی اس امرِ واقعی سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آنحضرتؐ کی یہی حیثیت مانی ہے اور اسی بنا پر اسلام کے قانونی نظام میں سنت کو قرآن کے ساتھ ماخذِ قانون تسلیم کیا گیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص سنت کی اس قانونی حیثیت کو کیسے چیلنج کر سکتا ہے جب تک وہ صاف صاف یہ نہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف تلاوتِ قرآن کی حد تک نبی تھے اور یہ کام کر دینے کے ساتھ ان کی حیثیتِ نبوت ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اگر وہ ایسا دعویٰ کرے بھی تو اسے بتانا ہو گا کہ یہ مرتبہ وہ آنحضرتؐ کو بطورِ خود دے رہا ہے یا قرآن نے حضورؐ کو یہی مرتبہ دیا ہے؟ پہلی صورت میں اس کے قول کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسری صورت میں اسے قرآن سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا ہو گا۔

(۳) سنت کو بجائے خود ماخذِ قانون تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے

معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ میں اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ آج پونے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہم کو اس مسئلے سے سابقہ نہیں پیش آگیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس قبل جو نبوت مبعوث ہوئی تھی اس نے کیا سنت چھوڑی تھی۔ دو تاریخی حقیقتیں ناقابلِ انکار ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر جو معاشرہ اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے، اس کی زندگی میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا ہے، اور اس کے تمام ادارے اس ساری مدت میں پیہم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرزِ فکر، اخلاق اور اقدار، عبادات اور معاملات، نظریۂ حیات اور طریقِ حیات کے اعتبار سے جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے، جس میں اختلاف کی بہ نسبت ہم آہنگی کا عنصر بہت زیادہ موجود ہے، جو ان کو تمام روئے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک امت بنائے رکھنے کی سب سے بڑی بنیادی وجہ ہے، یہی اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس معاشرے کو ایک سنت پر قائم کیا گیا تھا اور وہ سنت ان طویل صدیوں کے دوران میں مسلسل جاری رہی ہے۔ یہ کوئی گم شدہ چیز نہیں ہے جسے تلاش کرنے کے لیے ہم اندھیرے میں ٹٹولنا پڑ رہا ہو۔ دوسری تاریخی حقیقت، جو اتنی ہی روشن ہے، یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ معلوم کرنے کی پیہم کوشش کرتے رہے ہیں کہ سنتِ ثابتہ کیا ہے اور کیا نئی چیز ان کے نظامِ حیات میں کسی جعلی طریقے سے داخل ہو رہی ہے۔ چونکہ ان کے لیے سنت قانون کی حیثیت رکھتی تھی، اسی پر ان کی عدالتوں میں فیصلے ہوتے تھے اور ان کے گھروں سے لے کر حکومتوں تک کے معاملات چلتے تھے، اس لیے وہ اس کی تحقیق میں بے پروا اور لاابالی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافت کے زمانے سے لے کر آج تک نسلاً بعد نسلٍ میراث میں ملے ہیں، اور بلا انقطاع ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ہے۔ ان دو حقیقتوں کو اگر کوئی اچھی طرح سمجھ لے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع کا باقاعدہ علمی مطالعہ کرے تو اسے کبھی یہ شبہ لاحق نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی لاینحل معما ہے جس سے وہ دوچار ہو گیا ہے۔

(۴) بلاشبہ سنت کی تحقیق اور اس کے تعین میں بہت سے اختلافات ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ایسے ہی اختلافات قرآن کے بہت سے احکام اور ارشادات کے معنی متعین کرنے میں بھی ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایسے اختلافات اگر قرآن کو چھوڑ دینے کے لیے دلیل نہیں بن سکتے تو سنت کو چھوڑ دینے کے لیے انہیں کیسے دلیل بنایا جا سکتا ہے۔ یہ اصول پہلے بھی مانا گیا ہے اور آج بھی اسے ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جو شخص بھی کسی چیز کے حکم قرآن یا حکم سنت ہونے کا دعویٰ کرے وہ اپنے قول کی دلیل دے۔ اس کا قول اگر وزنی ہوگا تو امت کے اہلِ علم سے یا کم از کم ان کے کسی بڑے گروہ سے اپنا سکہ منوا لے گا، اور جو بات دلیل کے اعتبار سے بے وزن ہوگی وہ بہرحال نہ چل سکے گی۔ یہی اصول ہے جس کی بنا پر دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں مسلمان کسی ایک مذہب فقہی پر مجتمع ہوئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکامِ قرآنی کی کسی تفسیر اور سننِ ثابتہ کے کسی مجموعے پر اپنی اجتماعی نظام کو قائم کیا ہے۔

دوسرا اعتراض میرے مقالے پر یہ کیا گیا ہے کہ میرے کلام میں تناقض ہے، یعنی میرا یہ قول کہ قرآن و سنت کے واضح اور قطعی احکام میں تبدیلی کا اختیار کسی کو نہیں ہے، معترض کے نزدیک میرے اس قول سے متناقض ہے کہ استثنائی حالات و واقعات میں ان احکام سے ہٹ کر کام کرنے کی گنجائش اور اس کے مواقع اجتہاد سے متعین کیے جا سکتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس میں کیا تناقض محسوس کیا گیا ہے۔ اضطرار اور مجبوری کی حالت میں عام قاعدے سے استثناء دنیا کے ہر قانون میں ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی ایسی رخصتوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، اور ان مثالوں سے فقہاء نے وہ اصول متعین کیے ہیں جن کو رخصت کی حد اور اس کے مواقع متعین کرنے میں ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ مثلاً الضرورات تبیح المحظورات اور المشقۃ تجلب التیسیر۔

تیسرا اعتراض ان سب لوگوں پر کیا گیا ہے جنہوں نے یہاں اپنے مقالات میں اجتہاد کی کچھ شرائط بیان کی ہیں۔ چونکہ میں بھی ان میں سے ایک ہوں اس لیے اس کا جواب میرے ذمہ بھی ہے۔ میں عرض کروں گا کہ براہِ کرم ایک دفعہ پھر ان شرطوں پر ایک نگاہ ڈال لیجیے جو میں نے بیان کی ہیں اور

پھر بتائیے کہ آپ ان میں سے کس شرط کو ساقط کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ شرط کہ اجتہاد کرنے والوں میں شریعت کی پیروی کا مخلصانہ ارادہ پایا جاتا ہو اور وہ اس کے حدود کو توڑنے کے خواہشمند نہ ہوں؟ یا یہ شرط کہ وہ قرآن وسنت کی زبان، یعنی عربی سے واقف ہوں؟ یا یہ کہ انھوں نے قرآن وسنت کا کم ازکم اس حد تک گہرا مطالعہ کیا ہو کہ وہ شریعت کے نظام کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوں؟ یا یہ کہ پچھلے مجتہدین کے کیے ہوئے کام پر بھی ان کی نظر ہو؟ یا یہ کہ وہ دنیا کے معاملات اور مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں؟ یا یہ کہ وہ بدکردار اور اسلامی معیارِ اخلاق سے گرے ہوئے نہ ہوں؟ ان میں سے جس شرط کو بھی آپ غیر ضروری سمجھتے ہوں اس کی نشاندہی کر دیں۔ یہ کہنا کہ ساری اسلامی دنیا میں دس بارہ آدمیوں سے زیادہ ایسے نہیں مل سکتے جو ان شرائط پر پورے اترتے ہوں، میرے نزدیک دنیا بھر کے مسلمانوں کے متعلق بہت ہی بری رائے ہے۔ غالباً ابھی تک ہمارے مخالفوں نے بھی ہم کو اتنا گرا ہوا نہیں سمجھا ہے کہ چالیس پچاس کروڑ مسلمانوں میں ان صفات کے اشخاص کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ ہو۔ تاہم اگر آپ اجتہاد کا دروازہ ہر کس وناکس کے لیے کھولنا چاہیں تو شوق سے کھول دیجیے، لیکن مجھے یہ بتائیے کہ جو اجتہاد بدکردار، بے علم اور مشتبہ نیت واخلاص کے لوگ کریں گے اسے مسلمان پبلک کے حلق سے آپ کس طرح اتروائیں گے؟

ریاست کا اسلامی تصوّر

(مولانا امین احسن اصلاحی)

[یہ مقالہ بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ کی ایک نشست میں ۲ جنوری ۱۹۵۸ء کو پڑھا گیا۔ مولانا نے اصل مقالہ عربی زبان میں پڑھا تھا۔ یہاں اس کا ترجمہ دیا جا رہا ہے]

ریاست کا اسلامی تصوّر اس اصطلاح کے اندر چھپا ہوا ہے جو اسلام نے ریاست کی تعبیر کے لیے اختیار کی ہے۔ اسلامی لٹریچر پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام نے اپنے اصولوں پر قائم شدہ سیاسی تنظیم کے لیے ریاست یا سلطنت یا حکومت کی اصطلاحیں نہیں اختیار کی ہیں بلکہ خلافت یا امامت یا امارت کی اصطلاحیں اختیار کی ہیں۔ اس وجہ سے ریاست کا اسلامی تصور واضح کرنے کے لیے سب سے پہلے اِن اصطلاحات پر غور کرنا اور ان کے مضمرات کو سمجھنا ضروری ہے۔

خلافت اور امامت و امارت کی اصطلاحیں ہماری فقہ کی کتابوں میں عموماً بالکل مترادف المعنی اصطلاحات کی حیثیت سے استعمال ہوگئی ہیں جس کے سبب سے بعض اوقات کچھ خلط مبحث سا ہو جاتا ہے لیکن اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان اصطلاحات کے مفہوم الگ الگ ہیں۔ خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لیے استعمال ہوئی ہے اور امامت یا امارت سے مراد وہ گورنمنٹ ہوتی ہے جو خلافت کے ارادوں کی تنفیذ کرتی اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں سمجھیے کہ جو فرق STATE اور GOVERNMENT کے درمیان ہے اسی قسم کا فرق خلافت اور امامت و امارت کے درمیان ہے۔

اس تمہید سے یہ بات واضح ہوئی کہ ریاست کا اسلامی تصوّر سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ حقیقت ملحوظ رکھنی ہے کہ اسلام میں ریاست محض ایک ریاست نہیں ہے بلکہ وہ خلافت ہے۔

پھر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی ہوگی کہ کسی چیز کا صحیح تصور اس کی معیاری شکل ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے اس وجہ سے یہاں خلافت کی بھی صرف وہی شکل زیر بحث ہے جو معیاری ہے۔ اس کی بگڑی ہوئی شکلیں، جن کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں، اس بحث میں ہمارے لیے کارآمد نہیں ہو سکتیں۔

اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ہمیں سب سے پہلے اس خلافت کا سراغ انسانی فطرت اور انسانی معاشرہ کے اندر لگانا چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس بارہ میں اسلام نے ہمیں اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے کہ سیاسی فلسفیوں کی طرح انسان کے ابتدائی سیاسی تصورات سے متعلق ہمیں اٹکل کے تیر تکے چلانے پڑیں بلکہ وحی الٰہی نے ہمارے سامنے ایک واضح علم الانسان بھی رکھ دیا ہے جس سے ہم اس خلافت کی اصل اور ابتداء بھی معلوم کر سکتے ہیں اور اس کی روشنی میں اس کے بنیادی تصورات بھی سمجھ سکتے ہیں۔ میں یہاں اس علم الانسان کو قرآن سے اخذ کر کے اپنے الفاظ میں مختصر طور پر پیش کرتا ہوں

قرآن میں اس خلافت کی ابتدا اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کرنا چاہا تو سب سے پہلے فرشتوں کے سامنے اپنے اس ارادہ کا اظہار فرمایا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں کے علم میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم نہیں تھی اس وجہ سے ان کے حلقہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر اس نئی مخلوق کے پیدا کرنے سے مقصود اللہ تعالیٰ کا محض یہ ہوتا کہ یہ اس کی تسبیح و تقدیس کرے تو اس کو پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کام کے لیے تو ہم پہلے سے موجود ہی ہیں۔ لازماً یہ مخلوق خدا کے نائب کی حیثیت سے اس زمین کا انتظام و انصرام سنبھالے گی اور اس کے خلیفہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کو خدا کی طرف سے کچھ اختیارات بھی تفویض ہوں گے۔ پھر یہاں سے ان کو یہ اندیشہ بھی ہوا کہ اگر اس مخلوق کو اختیار بھی ملا تو یہ زمین میں عدل و انصاف کے بجائے خون ریزی اور فساد برپا کرنے والی مخلوق بن جائے گی۔ اپنا یہ اندیشہ فرشتوں نے ایک سوال کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جواب دیا کہ یہ شبہ تمہیں صرف اس وجہ سے لاحق ہوا ہے کہ تمہاری نظر میری پوری اسکیم پر نہیں ہے چنانچہ ان کو آدم کی ذریت کا

مشاہدہ کرایا گیا اور پھر ان سے سوال کیا گیا کہ اگر آدم اور ان کی اولاد کے بارہ میں تمہارا یہ گمان صحیح ہے تو بتاؤ، یہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب کے سب زمین میں فساد ہی برپا کرنے والے ہیں یا ان میں نیکی اور انصاف پھیلانے والے بھی ہیں؟ فرشتوں نے نہایت ادب کے ساتھ یہ اقرار کیا کہ انہیں اس بارہ میں کوئی علم نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو (جو پہلے سے اپنی ذریت کے ناموں سے واقف ہو چکے تھے) حکم دیا کہ وہ اپنی ذریت کے نام ان فرشتوں کو بتائیں۔ آدم نے فرشتوں کو اپنی ذریت کے ناموں سے آگاہ کیا اور ان کی نسل میں جو انبیاء و رسل اور جو مجددین و مصلحین پیدا ہونے والے تھے ان کا تعارف کرایا۔ اس سے فرشتوں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آدم اور اولاد آدم کو جو خلافت عطا ہو رہی ہے اگرچہ وہ اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ عطا ہو رہی ہے، جس سے خرابی کے بھی اندیشے ہیں لیکن ساتھ ہی اس اختیار و ارادہ کی حد بندی اور انسان کی اصلاح و تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب و شریعت بھی نازل فرمائے گا اور اپنے نبی اور رسول بھی بھیجے گا۔ اس انکشاف سے فرشتوں پر اللہ تعالیٰ کی اسکیم واضح ہو گئی اور وہ مطمئن ہو گئے۔

قرآن نے تاریخ انسانی کے اس بالکل ابتدائی ماجرا کو محض ایک کہانی کے طور پر نہیں سنایا ہے بلکہ اس کے سنانے سے اصل مقصود چند اجتماعی و سیاسی حقیقتوں کی ابتداء کا سراغ دینا ہے۔ اس سے خلافت کے تصور سے متعلق جو حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

ایک یہ کہ خلافت کا وجود خود انسانی فطرت کا رمز ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان کو خارج سے لاحق ہو گئی ہو بلکہ خدا نے اس کو اس منصب کے لیے پیدا کیا ہے اور اس کا شعور اس کے اندر ودیعت کیا ہے۔ وہ جب سے بھی اس دنیا پر ہے اس شعور کے ساتھ ہے اور اسی شعور نے اس کو سیاسی زندگی پر اکسایا ہے۔ اس نے سیاسی زندگی مصنوعی طور پر نہیں اختیار کی ہے اور نہ بے ضرورت اختیار کی ہے بلکہ یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے جس کو پورا کیے بغیر اس کی شخصیت کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی۔

دوسری یہ کہ اس زمین پر انسان کا فطری منصب خود مختار اور مطلق العنان ہستی کا نہیں ہے

بلکہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور نائب کا ہے۔ اس کو ایک خاص دائرہ کے اندر تصرف کا اختیار تو حاصل ہے لیکن یہ اختیار اس کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا تفویض کردہ ہے۔ اس وجہ سے اس کا وہی تصرف جائز اور معقول ہے جو خدا کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہو، ان سے ہٹ کر نہ ہو۔ اس نیابت کے تصور کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کو اپنے ہر اس تصرف کے لیے جواب دہی کرنی پڑے گی جو اصل مُستخلِف یعنی اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہو۔

تیسری یہ کہ اس میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے، نہ کہ انسانوں کی۔ اس میں قانون سازی اور تصرف کے جو اختیارات انسانوں کو حاصل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے تحت ہیں۔ یا پھر ان دائروں کے اندر ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے۔

چوتھی یہ کہ منشائے تخلیق کے اعتبار سے تو اس منصب کے اہل سارے ہی انسان ہیں، اس کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے جو صلاحیتیں درکار ہیں وہ بھی ہر ایک کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان اس منصب پر مجبور نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اس کو اختیار کرے اور نہ چاہے تو نہ اختیار کرے۔ وہ خدا کے حدود کا پابند رہ کر اس کا خلیفہ بھی بن سکتا ہے اور ان حدود سے آزاد ہو کر اس کا باغی بھی بن سکتا ہے۔ جس طرح ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا تو کیا ہے اپنی بندگی ہی کے لیے لیکن کسی کو اس بندگی پر مجبور نہیں کیا ہے بلکہ ہر ایک کو آزاد چھوڑا ہے، وہ بندگی کرے یا نہ کرے۔ اسی طرح اس خلافت پر بھی اس نے کسی کو مجبور نہیں کیا ہے۔

پانچویں یہ کہ اس منصب کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں انسان اگر اس اسکیم کی پابندی نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پسند فرمائی ہے تو انسان کا فساد اور خوں ریزی میں مبتلا ہو جانا بہت اقرب ہے۔

چھٹی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مبہم نہیں چھوڑا ہے کہ وہ اپنی زمین کے انتظام کے سلسلہ میں کس چیز کو پسند کرتا ہے اور کس چیز کو پسند نہیں کرتا ہے۔ علاوہ منصب خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی پسند و ناپسند اپنے احکام و ہدایات سے باخبر رکھنے کا انتظام کرے چنانچہ

فرشتوں کو جو شبہ تھا کہ انسان خلافت پا کر فساد و خوں ریزی میں مبتلا ہو جائے گا وہ اسی بات سے دور ہوا کہ اولاد آدم میں نبوت و رسالت کا سلسلہ بھی جاری ہو گا اور ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی کتابیں اور اپنی شریعت بھی نازل فرمائے گا۔

ساتویں یہ کہ خلافت کی اساس قوم یا وطن یا نسل اور نسب کے تصورات پر نہیں ہے بلکہ یہ اپنے مزاج اور اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک اصولی اور جہانی ریاست ہے۔

آٹھویں یہ کہ یہ نظام، کامل مساوات کے اصول پر قائم ہے۔ اس میں خلافت کا منصب کسی خاص شخص، یا گروہ، یا طبقہ کو حاصل نہیں ہے بلکہ اصلاً ہر شخص کو حاصل ہے۔ اس میں اگر کسی کو کسی پر ترجیح حاصل ہوتی ہے تو وہ محض اہلیت و صلاحیت کی بنا پر اور یہ بھی سب کے مشورہ اور مرضی سے۔

اوپر ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ خلافت اختیار پر مبنی ہے نہ کہ جبر پر۔ اس اختیار کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ مختلف قوموں کو زمین میں اقتدار بخشے اور یہ اقتدار بخش کر ان کا امتحان کرے کہ وہ اپنی من مانی چلاتی ہیں یا اس اقتدار کو خدا کے مقرر کردہ حدود کا پابند رکھتی ہیں۔ جو قومیں اس اقتدار کو پا کر خدا سے بغاوت کی روش اختیار کرتی ہیں وہ مجرم قرار پاتی ہیں اور امتحان کی مقررہ مدت گزر چکنے کے بعد وہ فنا کر دی جاتی ہیں۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا ذکر سورہ یونس کی آیات ۱۳-۱۴ میں اس طرح فرمایا ہے۔

"اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جبکہ انہوں نے ظلم کیا اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم مجرموں کو۔ پھر ہم نے ان کے بعد زمین میں تم کو خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔"

یہ خلافت بالقوہ اگرچہ سارے ہی انسانوں کو حاصل ہے لیکن بالاستحقاق یہ صرف ان کو حاصل ہے جو اس کا حق ادا کریں۔ چنانچہ حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اپنا خلیفہ قرار دیا ہے اس لیے کہ ان کی حکومت اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق تھی۔

"اے داؤد، ہم نے تم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا تو تم لوگوں کے درمیان انصاف کے

ساتھ فیصلہ کرے"۔ (۲۶-ص)

اس خلافت کے حقیقی اہل درحقیقت انبیاء علیہم السلام ہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے طریقہ پر اس کی ذمہ داریاں ادا کریں۔ جو لوگ خدا کی بندگی اور اطاعت کے لیے منظم ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اس خلافت کا خلعت عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا ہے۔

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے بھلے کام کیے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں اسی طرح خلافت دے گا جس طرح اس نے ان کے اگلوں کو دی اور ان کے لیے ان کے اس دین کا بول بالا کرے گا جس کو ان کے لیے پسند فرمایا۔ اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی بندگی کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔"

یہی خلافت کی معیاری شکل ہے۔ جب تک یہ اپنی ان خصوصیات پر باقی رہے یہ زمین کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ یہ خصوصیات اگر کم ہونی شروع ہو جائیں تو یہ اس کے بگاڑ کی صورتیں ہونگی اور اس بگاڑ کے مختلف درجے ہیں۔ ایک خاص درجہ تک یہ بگاڑ اس کو خلافت کے دائرہ سے خارج نہیں کرتا لیکن اگر یہ بگاڑ اس کی بنیادی خصوصیات کو ختم کر دے تو پھر یہ خلافت نہیں باقی رہ جاتی بلکہ بغاوت اور فساد فی الارض بن جاتی ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہا کہ ایک عام ریاست اور ایک اسلامی ریاست (بالفاظ دیگر خلافت) میں کس اعتبار سے اشتراک اور کن پہلوؤں سے اختلاف ہے۔ ارسطو نے انسان کی یہ جو تعریف کی ہے کہ وہ حیوانِ ناطق ہے "یہ تعریف جس طرح ایک کافر پر صادق آتی ہے اسی طرح ایک مومن پر بھی صادق آتی ہے۔ کیونکہ اپنے مادی اور جبلی دائروں میں وہ دونوں ایک ہی طرح کی ضروریات اور ایک ہی قسم کے داعیات رکھتے ہیں لیکن پھر بھی ہر شخص جانتا ہے کہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک کافر کے اصول زندگی اور ہیں اور ایک مسلم کے اصول زندگی اور ہیں۔ اسی طرح ایک عام ریاست اور ایک اسلامی ریاست میں بھی جہاں تک ان کے ظاہری ڈھانچہ اور ان کے مادی اجزائے ترکیبی کا تعلق ہے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ایک عام ریاست جس طرح اپنے وجود پذیر ہونے کے لیے اس امر کی محتاج ہے کہ

(باقی صفحہ ۲۳۲ پر)

اسلام میں فرد کے حقوق

(از ڈاکٹر مہدی غلام (مصری)

[یہ مقالہ اسلامی مجلس مذاکرہ میں یکم جنوری کو پڑھا گیا]

یہ مضمون، اسلامی معاشرے کے صرف ایک پہلو سے بحث کرتا ہے، اور وہ پہلو یہ ہے کہ اسلامی معاشرے نے فرد کو کیا حقوق دیئے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ حقوق اپنے جلو میں کچھ ایسے فرائض کو بھی لیے ہوئے ہیں، جو ان حقوق کی مطابقت سے معاشرے کے دوسرے افراد یا پوری قوم پر عائد ہوتے ہیں۔

مضمون کی ابتدا قومی زندگی کی سب سے چھوٹی وحدت سے اگر کی جائے تو غالباً یہ آسان طریق کار ہوگا۔ قومی زندگی کی سب سے چھوٹی وحدت، ایک خاندان ہوتا ہے جو قوم اور فرد کے درمیان رشتے کو استوار کرتا ہے۔

اسلام میں خاندانی زندگی کا تصور محبت اور ہمدردی کی مستحکم بنیاد پر قائم ہے۔ یعنی میاں اور بیوی میں محبت، والدین اور اولاد میں محبت، اور پھر ان سب کا دوسرے عزیز و اقارب سے محبت و ہمدردی کا رشتہ۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام میں تو گھر کے ملازمین کو بھی گھر کے افراد کی حیثیت دی گئی ہے چنانچہ اسلام گھریلو ملازموں کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ گھر کے مالک جو کھانا کھائیں، ملازموں کو بھی وہی کھانا ملے، جیسے کپڑے مالک خود پہنیں ملازم کو بھی ویسے ہی کپڑے پہنائے جائیں اور یہی چیز رہائش کے بارے میں بھی کہی گئی ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ حقوق پالتو جانوروں تک کو دیئے گئے ہیں۔ ان جانوروں کے تحفظ اور ان کی بہبود کے لیے اسلام نے بڑے واضح احکام دیئے ہیں۔ ان حقوق کی اساس وہ رشتہ ہے جس پر اسلام نے مسلمان گھرانے کی عمارت کھڑی کی ہے، اور اس رشتے کی تشریح قرآن پاک میں یوں کی گئی ہے

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۔	خدائے پاک کے وجود کی ایک دلالت یہ بھی ہے کہ اس نے تم میں سے ہی تمہارے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان کے ہمراہ امن و راحت کی زندگی بسر کرسکو، اور اس نے تمہارے دلوں میں محبت اور جذبۂ ترحم کو جاگزیں کیا ہے

محبت اور دردمندی کے اس سائے میں اسلام نے انسان کو ان حقوق سے سرفراز فرمایا ہے۔

ذاتی تحفظ کا حق یہ حق ہر فرد کے لیے ہے، اور قوم کو یہ حق ہر فرد کو دینا چاہیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نے اس حق کو اس قدر

مقدس بنا دیا گیا کہ اپنی جان کی حفاظت ہر فرد کے لیے فرض قرار دے دی گئی۔ اس بارے میں ارشاد خداوندی ہے:
لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ "اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان فراہم نہ کرو" (۲ : ۱۹۵) چنانچہ
خودکشی مذہباً حرام اور گناہِ عظیم ہے۔ رسولِ مقبول کا یہ ارشاد ہے "جو شخص پہاڑی پر سے کود کر خودکشی
کرتا ہے، وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ اسی عمل کو دہرائے گا اور جو شخص زہر کھائے گا، وہ جہنم میں ہمیشہ زہر
ہاتھ میں لیے اسے کھاتا رہے گا، اور وہ شخص جو لوہے کے ڈنڈے سے اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے وہ
دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لوہے کا ڈنڈا اپنے پیٹ میں چبھوتا رہے گا" یہی نہیں بلکہ خودکشی کے بارے
میں فقط سوچنا یا اس کی خواہش کرنا بھی ممنوع ہے، جیسا کہ رسول اکرم کے ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے،
"دیکھو تم میں کسی کو ہرگز موت کی خواہش نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ جو کوئی ایسا کرتا ہے، ہوسکتا ہے وہ
ایک نیک انسان ہو اور زیادہ دیر تک زندہ رہ کر وہ نیکی کے کچھ اور کام کر جائے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے
کہ وہ ایک برا آدمی ہو، مگر کچھ دیر زندہ رہ کر اس کی اصلاح ہو جائے۔"

تعلیم کا حق اسلام چونکہ ایک ایسا مذہب ہے جو روشن دماغی کو پسند کرتا ہے اور بصیرت پھیلانا
چاہتا ہے۔ اس لیے نہ تو اس کا انحصار جہالت پر ہے نہ ہی یہ ذہنی اضمحلال اور اندھی
تقلید کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ انس ابن مالکؓ یہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اکرمؐ کے
سامنے ایک شخص کا ستائشی انداز میں ذکر کیا گیا۔ اس پر آپ نے پوچھا، اس کی عقل کیسی ہے۔ لوگوں نے
جواب دیا۔ اسے خدا کے رسول وہ انتہائی عبادت گذار ہے۔ اس کا کردار نہایت اعلیٰ ہے۔ وہ بے حد
پرہیزگار ہے، وہ بڑا خوش اطوار ہے۔ اس جواب پر رسول اکرمؐ نے اسی سوال کو دہرایا، اس
کے جواب میں لوگوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! ہم اس کی تعریف و ستائش اس کی [illegible] اور نیک
خصائل کی بنا پر کرتے ہیں لیکن آپ ہم سے اس کی ذہنی تکمیل و تربیت کے بارے میں دریافت فرماتے
ہیں، اس پر رسول اللہ نے کہا کہ ایک نادان عبادت گزار اپنی جہالت اور بے خبری کے باعث ایسے
ایسے اعمال کا ارتکاب کرتا ہے جو ایک برے انسان کی برائیوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں، لیکن لوگوں
میں درجہ بندی تو ان کی خدائے تعالیٰ سے محبت کی بنا پر ان کے اعمال سے ہوتی ہے اور یہ اعمال ان کی ذہنی نشو و نما ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔
اس نکتے کے بارے میں شاید سب سے زیادہ نمایاں دلیل وہ آیت ہے جو سب سے پہلے حضور پر نازل ہوئی اور جو یوں ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔	اپنے خدا کے نام پر پڑھو، جس نے کائنات کی تخلیق کی۔ جس نے انسان کو حقیر مادے سے خلق کیا، پڑھو اور تمہارا خدا جو سب سے زیادہ لائقِ تقدیس ہے جس نے قلم کے ذریعے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا

آزادیٔ فکر کا حق

یہ اسلام فرد کو انفرادی و شخصی فیصلے کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ جب قرآن مجید میں مثال کے طور پر اس آیت میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ "یقیناً ہم نے اولادِ آدم کو وقار بخشا ہے" تو اس وقار میں لازماً دو چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ یعنی ایک طرف تو یہ کہ اسے اپنے اعمال کا ذمے دار ہونا چاہیے، اور دوسری طرف یہ کہ انسان کو آزادیٔ فکر میسر ہونی چاہیے۔ رسولِ خدا کے اس ارشاد سے اس بات کی وضاحت پوری طرح ہو جاتی ہے کہ "تم میں سے کسی کو بھی اس عذر کی بنا پر اندھی تقلید نہیں کرنی چاہیے، کہ میں تو لوگوں کی پیروی کرنے والا ہوں، اگر وہ نیکی کا کام کرتے ہیں تو میں بھی نیک کام کر پاؤں گا۔ اور اگر وہ بدی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو میں بھی اسی راہ پر چلوں گا بلکہ تمہیں حق کی راہ پر ثابت قدمی سے چلنا چاہیے، اگر یہ لوگ نیکی کے کام کریں تو ان کی تقلید کرو، لیکن برے کاموں میں ان کا ساتھ نہ دو۔" ایک اور ارشاد میں حضور نے اس اصول کا بیان اس طرح کیا ہے کہ اسے انسان کے ایک حق کے درجے سے اٹھا کر اسے فرض کا رتبہ دے دیا ہے۔ ہر وہ شخص جو تعصب، جھوٹے وقار اور جہالت پر مبنی جنگ لڑتا ہے، اور یوں اپنے قبیلے کے لیے غیظ و غضب کی راہ اختیار کرتا ہے، اپنے قبیلے کے مقاصد کا علمبردار بنتا ہے اور اپنے قبیلے کے نقطۂ نظر کی حمایت کرتا ہے، اگر اس جنگ میں وہ کام آتا ہے تو وہ مسلمان کی موت نہیں مریگا۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ ہمیں آزادانہ غور و فکر سے محروم نہیں کیا گیا: تاکہ ہم کہیں اسی قسم کی زنجیروں میں جکڑے نہ رہ جائیں، جن میں ظہورِ اسلام سے قبل کے عرب گرفتار تھے، اور جو بہر صورت اپنے قبیلے کی حمایت کرتے تھے، خواہ قبیلہ حق پر ہو یا نہ ہو۔

جہاں تک انسانی فیصلے اور رائے کو قائم کرنے کا تعلق ہے اس میں اسلام نے ہمیشہ غلطی کو قابلِ معافی خیال کیا ہے، بشرطیکہ یہ غلطی دیانتدارانہ غور و فکر کا نتیجہ ہو، اسلام کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے اخلاقی فیصلے کو بروئے کار لاتے ہوئے صحیح رائے قائم کرے گا اسے دگنا صلہ ملیگا

لیکن اگر وہ غلط رائے قائم کرلے تو اس کا صلہ اسے ایک ہی بار ملیگا اور وہ اس بات کا صلہ ہوگا کہ اس نے اپنی قوت فیصلہ سے کام لیا۔

عورتوں کے حقوق

مسلمان عورت ہی دنیا بھر میں وہ پہلی عورت ہے جو آزادی سے ہمکنار ہوئی، مگر یہاں اس بات کا خیال رہے کہ میں ایسے فرقوں یا قوموں کا ذکر نہیں کر رہا جو کہنے کو تو اسلام کی نام لیوا ہیں۔ مگر اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل نہیں کرتیں۔ آیئے ہم پیغمبر اسلام اور ان کے صحابۂ کرام کے عہد پر نظر ڈالیں۔ اس عہد میں ہمیں جنگ احد میں عورتیں وہی خدمات سر انجام دیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جو عہد جدید کی عورتیں ادا کرتی ہیں[1] یعنی فوجیوں کے آرام و آسائش کی نگہبانی اور زخمیوں کی مرہم پٹی جیسی خدمات، اس عہد میں ہی ہمیں وہ عورتیں نظر آتی ہیں، جو حضرت عمرؓ سے اس وقت بحث و تمحیص کرتی دکھائی دیتی ہیں جبکہ وہ مسجد میں مہر کی زیادتی کی تنقیص کر رہے ہوتے ہیں، اس خطبے کے دوران میں ایک عورت انہیں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ کر ٹوکتی ہے وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا "اگر تم نے اپنی بیوی کو سونے کا ڈھیر دے دیا ہو تو پھر اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔" اس پر حضرت عمرؓ اس کے اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں "اس عورت نے حق بات کہی جب کہ عمر غلط بات کہہ رہا تھا۔"

چودہ سو برس پہلے اسلام نے عورت کے اقتصادی و معاشرتی حقوق کا واضح اعلان کیا، لیکن مغرب کی عورت اپنی مسلمان بہن سے ایک ہزار برس بعد ان سے ملتے جلتے حقوق حاصل کر پائی۔[2]

---

[1] اس معاملے میں ہم صاحب مقالہ سے اتفاق نہیں رکھتے۔ وہ پاکباز اور نیک نفس خواتین جنگ میں اپنے بھائیوں اور شوہروں کی خدمت تو بلا شبہ بڑی بے نفسی اور بے لوثی سے کرتیں مگر وہ عہد حاضر کی عورتوں کی طرح سپاہیوں کے سفلی جذبات کی تسکین کا باعث نہ بنتیں۔ اُن کی زندگیاں اتنی پاک اور مقدس تھیں کہ کسی فوجی کا طائر وسوسہ بھی اُن کے حریم عصمت کی طرف پرواز نہ کرتا۔ (ترجمان القرآن)

[2] فاضل مقالہ نگار کا یہ خیال کہ مغربی عورت اپنی مسلمان بہن سے ملتے جلتے حقوق حاصل کر چکی ہے انتہائی خوش فہمی پر مبنی ہے۔ عورت کی مٹی جس طرح آج کے اس آزادی اور روشنی کے دور میں پلید ہو رہی ہے اس کی مثال تاریخ انسانی میں بہت کم ملتی ہے۔ آج بیچاری عورت مرد کی ہوسناکی کا محض ایک کھلونا بن کے رہ گئی ہے۔ اس م

ظہور اسلام سے پہلے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی جو غیر اسلامی رسم موجود تھی اسلام نے اس کا استیصال کر دیا۔ اور عورتوں کے لیے خاندان میں قابلِ عزت جگہ پیدا کی اور بچوں میں ایسے امتیازی سلوک کو ممنوع قرار دیا جو لڑکوں کے حق میں ہو، چنانچہ رسول اکرم کا یہ ارشاد ہے "ہر وہ شخص جس کی ایک لڑکی ہو، اگر وہ اسے زندہ دفن کرنے سے اجتناب کرتا ہے اس کے ساتھ ذلت کا برتاؤ نہیں کرتا اور اس کے مفاد کے خلاف لڑکے کے حق میں جانبداری کا مظاہرہ نہیں کرتا تو اس کا مقام جنت ہو گا"۔ "بہترین مسلمان بہترین صاحبِ اخلاق ہوتے ہیں اور اپنی بیویوں کے بہترین خاوند ہوتے ہیں"۔ "تم میں سے بہترین وہ ہیں جو اپنی عورتوں سے بہترین سلوک روا رکھتے ہیں اور تم میں سے اعلیٰ ترین وہ ہیں جو اپنی بیویوں سے اعلیٰ ترین برتاؤ کرتے ہیں، اور تم میں سے میں اپنی عورتوں سے سب سے بہتر سلوک کرنے والا ہوں"۔ عورتوں کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے پیغمبر اسلام اپنی تعلیمات میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ یہ اعلان فرمایا کہ "جنت ماں کے قدموں میں ہے"۔

اسلام نے مسلمان عورت کو اپنے مرحوم رشتہ داروں کی جائداد کا حصے دار بنایا ہے، اور یہ حصہ اس کی مالی ذمے داریوں کے مطابق ہوتا ہے، کیونکہ شادی سے پہلے اور اس کے بعد ہمیشہ عورت کی ضروریات کا بندوبست مرد کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ اور اسے اپنی روزی کمانا نہیں ہوتی۔ اس لیے وراثت میں اس کا حصہ مرد سے آدھا مقرر کیا گیا ہے۔ یہ ایک مناسب تقسیم ہے اور اس امر میں بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ وراثت کے حصے کی یہ تقسیم مغرب کے اس نظام سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کے ذریعے عورت کو اس کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا جس قدر اس کے لیے وصیت نامے میں لکھا گیا ہو،

اسلام نے، ماں اور مادرانہ حیثیت کا مختلف طریقوں سے تحفظ کیا ہے، مثلاً ایک ایسی عورت کو جو امید سے ہو بچے کی پیدائش سے قبل قید کرنا ممنوع قرار دیا ہے، اسلام نے عورت کو جو حقوق عطا کیے

صبر کملانے اور اولاد جننے اور اُس کی پرورش کرنے کی بیشمار ذمہ داریاں عائد کر دی گئی ہیں اور حقوق کے معاملے میں صرف ایک ہی چیز اُس بیچاری کے حصہ میں آتی ہے اور وہ ہے گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کا اختیار۔ اگر اس سلسلہ میں مزید معلومات درکار ہوں تو ایک کتاب "عورت کا حیاتیاتی حزتیہ" ملاحظہ فرمائیں (ترجمان القرآن)

ہیں ان میں سے مہر اور شوہر کی معاشی و معاشرتی حیثیت بھی شامل ہے۔ جو تحفے تحائف خاوند اپنی بیوی کو دے، اسلام انھیں عورت کی ملکیت قرار دیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ عورت کا سرپرست اسے کسی ایسے شخص سے شادی کرنے سے روکنے کا مجاز ہے جو اس کی اپنی سماجی حیثیت سے کمتر حیثیت رکھتا ہو۔ یہ اقدام اس حالت میں عورت کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے جب وہ اپنے سے کمتر درجے کے مرد پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔

میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ میں غیر اسلامی نظام ہائے حیات پر نکتہ چینی کروں، لیکن مسلمان عورت کے حقوق پر تبصرہ کرتے ہوئے دو ایک باتوں کی جانب اشارہ کرنا لازمی سمجھتا ہوں، ان میں سے ایک تو ملکیت جائداد کا حق ہے، جو مغربی عورت کو حال ہی میں ملا ہے، کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے تک متمول مغربی خاتون کی جاگیر، اور مزدور عورت کی تنخواہ دونوں ہی کو شوہر کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۸۹۱ء تک تو انگریزی قانون شوہر کو بیوی کے محبوس کرنے کا حق بھی دیتا تھا، ۱۸۵۷ء تک کسی انگریز عورت کو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے بغیر طلاق حاصل کرنے کا حق تک نہیں تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ملک میں صرف دو عورتیں طلاق حاصل کر پائی تھیں۔

اسلام نے طلاق کے بارے میں ایسے وسیع اصول اختیار کیے جو عورت اور گھر دونوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور پھر ان اصولوں کی بنیادی روح کو نقصان پہنچائے بغیر ہر قوم کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے تجربے اور ضرورتوں کے مطابق ان اصولوں کو عمل میں لائے۔

عالم طفولیت کے حقوق

اسلام کے عطا کردہ انتہائی اہم حقوق عالم طفلی کے وہ حقوق ہیں جن کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی خواتین کی تشکیل کی جاتی ہے۔ اسلام بچوں کے حقوق کو ان کی پیدائش سے بھی پہلے تسلیم کرتا ہے، رسول مقبولؐ نے نیک اولاد کے لیے نیک ماؤں کے انتخاب کا مشورہ دیا۔ عورتوں سے خبردار رہو، اور اپنی اولاد کے لیے بہتر ماؤں کا انتخاب کرو۔

اسلام پیدائش سے قبل بچے کو کسی قسم کی اذیت پہنچانا ممنوع قرار دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حاملہ عورت کو قید کرنے کی اجازت نہیں ہے، ایسی عورت کو بچہ جننے کے بعد ہی سزا دی جاسکتی ہے، پھر بچے کے

نام کے انتخاب میں بھی اس احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ وہ نام مستقبل میں اس کے لیے کسی قسم کی اذیت، شرم یا تشویش کا باعث نہ بنے۔ رسول کریمؐ نے کہا ہے "والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ بچے کو تعلیم دیں۔ اس کا اچھا نام رکھیں اور شادی کی عمر میں اس کی شادی میں اس کی مدد کریں"

والدین کے مقابلے میں بھی اسلام بچے کا تحفظ کرتا ہے، اسلام بچے کو روزی کی خاطر ایسے کام کی اجازت نہیں دیتا جو اس کے جسم، ذہن یا اخلاق کو بگاڑے، اس مسئلے کے اخلاقی پہلو پر اسلام حضور کے ان الفاظ میں زور دیتا ہے "بچوں کو روزی کمانے پر مجبور نہ کرو، کیوں کہ اگر وہ یہ محسوس کریں گے کہ انہیں اپنی روزی کمانا ہے تو وہ چوری کرنے لگیں گے" اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ ایسی کچی عمر میں بچے کا معیار اقدار اتنا پختہ نہیں ہوتا کہ وہ دولت کے حصول میں ذرائع کی پرواہی کرے چنانچہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ چوری، مکر و فریب اور اسی قسم کی دوسری برائیوں کی ترغیب سے بچ نہ سکے۔

اسلام نے والدین کی طرف سے غلط رہنمائی کے خلاف بھی بچے کی حفاظت کی ہے، رسول مقبول فرماتے ہیں "والدین کی بات سننا اور حکم ماننا اسی وقت تک لازم ہے، جب تک کہ وہ غلط کام کرنے کے لیے نہ کہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس قسم کے حکم پر کان دھرنا اور اسے بجالانا دونوں غیر ضروری ہو جاتے ہیں۔

اسلام نے ہمسائے کے جو حقوق مقرر کیے ہیں ان پر غور و فکر قابل لحاظ ہے، ہمسایے کے حقوق صرف اس بات تک محدود نہیں ہیں کہ اس سے اچھے ہمسایے کا سا سلوک کیا جائے، بلکہ انہیں تو مسلمان کے دین کا جزو بنا دیا گیا، اسلام نے ہمسایے کو حق شفع عطا کیا ہے جو ہمسایے کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور اسے خصوصی مراعات دیتا ہے۔

مجھے یہاں سرسری سے انداز میں ملازموں کے حقوق کا ذکر بھی کرنا ہے، اسلام نے ملازموں کے حقوق پر اس قدر زور دیا ہے، کہ ان حقوق کو ان الفاظ ہی میں مختصر طور پر سمیٹا جا سکتا ہے کہ ملازموں کو وہی خوراک دی جائے، اور وہی کپڑا پہنایا جائے، جو خود مالک استعمال کرتے ہوں اور پھر مالک کی طرف سے ملازم کو جب بھی کوئی کام دیا جائے تو مالک کو چاہیے کہ اس کام میں ملازم کی مدد کرے۔

گھر لانے کے حقوق اس قدر جامع ہیں کہ ان میں جانور تک آ جاتے ہیں۔ اسلام نے ہمارے ان بے زبان رفیقوں کی حفاظت کے جو حقوق وضع کیے، ان سے ملتے جلتے اور مشابہ حقوق کے لیے مطالبہ کرنے اور غور و فکر کرنے کے لیے عصرِ حاضر کی انسداد بے رحمی مویشیاں ایسی انجمنوں کے وجود میں آنے کے لیے ایک ہزار سال سے بھی زائد عرصہ درکار تھا۔ ہمیں سفر کرتے وقت یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ایسی راہ اختیار کریں جس میں چراگاہیں آتی ہوں۔ ایسے اصطبل جہاں مویشی رات بسر کرتے ہوں، ان کے انتخاب میں یہ احتیاط برتی جائے کہ وہ ان کے لیے آرام دہ بھی ہوں اور جراثیم وغیرہ سے پاک بھی۔ حضورؐ نے یہ حکم دیا کہ گرمیوں میں رات کے وقت سفر کیا جائے "تاکہ بار برداری کے جانور دن کی شدید گرمی میں آرام کر سکیں۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ نے ایک عورت کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی لڑکیوں سے کہے کہ وہ دودھ دوہنے سے پہلے ناخن تراشیں تاکہ ناخن مویشیوں کے تھنوں کو زخمی نہ کریں۔ انہوں نے ہمیں اس بات کا حکم فرمایا ہے کہ منڈی میں یا کسی اور جگہ کھڑے ہو کر جب ہم باتیں کرنے یا خوش گپیوں میں مصروف ہوں تو ہمیں سواری پر سے اتر جانا چاہیے، کیونکہ جانور ایسے موقعوں کے لیے کرسی یا مونڈھے کا کام دینے کے لیے نہیں ہوتے۔"

مختصر یہ کہ اسلام نے فرد کو معاشرے میں جو حقوق عطا کیے ہیں، ان کا یہ بیان بعض انتہائی اہم حقوق کا پس خاکہ ہی سا پیش کرتا ہے۔ ان حقوق کے سلسلے میں دو نکتوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اوّل تو یہ کہ یہ حقوق کسی جدوجہد یا کشمکش کے نتیجے کے طور پر معرضِ وجود میں نہیں آئے، دوسرے یہ کسی اقتدار کی مخالفت میں بعض لوگوں کی جانب سے کیے جانے والے مطالبے کے جواب میں حاصل نہیں ہوئے۔ یہ تو از راہِ لطف و عنایت، خدائے عادل و رحیم کی جانب سے نازل ہوئے، اور اسلامی معاشرے کے بنیادی جزو بن کر اسلامی سماج کی بنیادی روح کی ترجمانی کرنے لگے۔ دوسرے یہ بھی ظاہر ہے کہ اسلام نے ان حقوق کا نفاذ ایک ہزار سال قبل کیا، اور یہ چیز بادشاہوں اور ان کی رعایا کے درمیان کسی قسم کی کشمکش کے بغیر وجود میں آئی، مگر میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) حقوقِ انسانی کا اعلان نامہ ۱۶۸۹ء اور انقلابِ فرانس (۱۷۸۹ء) تاریخ کے وہ ابواب ہیں جنہیں انسانیت کے خون سے لکھا گیا۔ اور ہزاروں لاکھوں انسانی زندگیاں اوجھی تلف ہوئیں لیکن صحت مند انسانی معاشرے کی تعمیر کے لیے اسلام نے یہ انسانی حقوق، انسان کو ایک نعمت اور عطیہ کی صورت میں بخشے۔

"اسلامی تہذیب"

(از ڈاکٹر میر ولی الدین)

اسلامی تہذیب (کلچر) کے معنی یا مفہوم کی وضاحت سے قبل میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ "کلچر" کے لغظی مفہوم کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں اور اس ضمن میں اسلامی تہذیب کے نقشمات پر روشنی ڈالوں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ "کلچر" کا لفظ کاشتکاری (اگریکلچر) کی قدیم ترین صنعت سے ماخوذ ہے، اور "کلچر" کا جو مجازی مفہوم ہے وہی "اگریکلچر" کا لغوی مفہوم ہے، یعنی زمین میں تخم ریزی، آبیاری، یا تخم کی زیرِ زمین حفاظت، تاکہ شدتِ تمازت انہیں جلا نہ ڈالے۔ ان کے نشو و نما کے لیے کافی وقت تک انتظار، پھر پودوں کے اگنے کے بعد آفاتِ ارضی و سماوی سے ان کا تحفظ۔ انہیں پانی دینا، ان کے اطراف باڑھ لگانا، تاکہ جانور انہیں روند نہ ڈالیں، کھا نہ جائیں، وھلم جرا۔

پھولوں کی کاشت ہو یا ترکاریوں کی یا کسی اور چیز کی اس کے لیے ضروری اجزا یہی تو ہیں؛ زمین صالح، عمدہ تخم، پرورشِ تخم کے خالص طریقے، اس زندگی کا جو ننھے ننھے بیجوں میں مستور ہے پودوں کی شکل میں رونما ہونا، پھر ان ہی نازک پودوں کی بالفاظ قرآن "مضبوط ہونا، پھر اپنی نال پر سیدھا کھڑا ہو جانا اور کھیتی والوں کو خوش کرنا" ۔ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (۴۸: ۲۹)

اسلامی کلچر کا مفہوم ان ہی اجزاء پر غور کرنے سے مجھے امید ہے کہ واضح ہو جائے گا: باغ جو مٹی سے اگتا ہے وہ آخر میں تباہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن جو باغ دل کی زمین سے اگتا ہے وہ لازوال ہوتا ہے اور یہی وہ اختلاف ہے جو کلچر اور اسلامی کلچر میں پایا جاتا ہے۔ یہی فرق مجاز و حقیقت میں ہے

گلشنے کز گل دمد گردد تباہ

گلشنے کز دل دمد وا فرحتاہ (رومی)

اسلامی تہذیب (کلچر) کی زمین گل نہیں دل ہے۔ قرآن کی زبان میں اس کو "قلب" سے تعبیر

کیا گیا ہے۔ اس لفظ کے دو معنی ہیں:

ایک تو گوشت کا وہ لوتھڑا جو صنوبری شکل کا ہوتا ہے اور سینے کے بائیں طرف رکھا گیا ہے اس کے اندر تجویف ہے۔ اس تجویف میں خون ہے اور یہی روح کا منبع سمجھا جاتا ہے۔ اس دل سے ہمیں کچھ غرض نہیں۔ اطبار کے لیے یہ ضروری ہے۔ یہ دل بہائم میں بھی موجود ہے بلکہ مردے کے جسم میں بھی موجود ہوتا ہے۔

قلب کے دوسرے معنی بھی ہیں، اس معنی میں وہ ایک لطیفۂ ربانی وروحانی ہے اس لطیفے کو قلب جسمانی سے تعلق یا لگاؤ ہوتا ہے، یہی لطیفۂ ربانی حقیقتِ انسان ہے، اسی کو ادراک علم و عرفان ہوتا ہے، یہی ہر خطاب کا مخاطب، عتاب کا معاتب، عقاب کا معاقب ہوتا ہے، اور اور اس کا تعلق لحم صنوبری سے ویسا ہی ہے جیسا کہ مرض کا جسم سے، وصف کا موصوف سے، متمکن کا مکان سے، مستعمل آلہ کا آلے سے، اس قلب کے متعلق کہا گیا ہے:

ماہیت دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خوں یہ دل بھی طوفان ہے ہمارا

اس لطیفۂ مدرکۂ عالمہ کو بعض دفعہ نفس، روح، عقل کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مفہوم وہی ایک ہے تعبیرات مختلف۔

یہی قلب وہ زمین ہے جس میں تہذیب اسلامی کی تخم ریزی ہوتی ہے، اس کو خس و خاشاک سے پاک وصاف کیا جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی اصلاح یا درستی سے سارا جسم درست ہو جاتا ہے یعنی سارے اعمال درست ہو جاتے ہیں اور اس کے بگڑنے سے سارا جسم بگڑ جاتا ہے، اس مفہوم کو ترجمانِ حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ادا فرمایا تھا:

ان فی جسد بنی آدم مضغۃ	انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست
اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا	ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر
فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی	وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے، جان لو کہ

القلب (رواہ البخاری) وہ قلب ہے۔

اس نکتے کو زیادہ واضح کرتے ہوئے کعب احبار رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

الانسان عیناہ ھادوا ذناہ قمع و لسانہ ترجمان ویداہ جناحان و رجلاہ بریدا والقلب منہ ملک فاذا طاب الملک طابت جنودہ

انسان کی دو آنکھیں اس کی رہنما ہیں، اس کے دو کان (گویا) قیف ہیں اور اس کی زبان ترجمان ہے، اور اس کے دو ہاتھ دو پر اور اس کے دو پیر قاصد اور اس کا دل بادشاہ ہے، جب بادشاہ اچھا ہو تو اس کا لشکر بھی اچھا ہوتا ہے۔

عائشہ صدیقہ نے یہ سُن کر کہا تھا ھکذا سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی سُنا ہے"

قلب کی زمین میں یقین کی کھاد تمام خس و خاشاک سے اس کو پاک و صاف کر دیتی ہے اس کو صالح یا طیب بنا دیتی ہے۔ یہ یقین حق تعالیٰ کے وجود کا یقین ہے۔ اس کے قرب و معیت و احاطت کا یقین ہے، اس کے خالق و رب ہونے کا یقین ہے، اس کے مالک و رب ہونے کا یقین، اس کے مولا و حاکم ہونے کا یقین ہے۔ اس کے اللہ ہونے کا یقین ہے، اور اس کے برعکس اپنے مخلوق و مربوب و مملوک و محکوم و مالوہ و عبد ہونے کا یقین ہے اس یقین کا کامل اظہار مسلم ایک کلمے کے ذریعے کرتا ہے جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے یہی کلمۂ طیبہ ہے جس کی مثال قرآن کریم میں ایک پاک درخت سے دی گئی ہے جس کی جڑ مضبوط ہے، جس کی شاخیں آسمان تک گئی ہیں اور حکم ایزدی سے جو ہر وقت پھل لاتا ہے اور میوہ دیتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي اُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ (سورہ ابراہیم آیت ۲۴ : ۲۵)

یہی کلمۂ توحید ہے جس کی جڑ دل میں قائم اور مستحکم ہوتی ہے، اور اس کی شاخیں یعنی عمل آسمان پر

پہنچتی رہتی ہیں اور ان کے پھل یعنی برکت ہر وقت حاصل ہوتی رہتی ہے، اس کلمے کی ضد کلمۂ کفر ہے جس کی مثال قرآنِ حکیم میں اس درخت خبیث سے دی گئی ہے جس کی نہ جڑ مستحکم، نہ شاخیں بلند، اسے زمین کے اوپر ہی سے جب کوئی چاہے اکھیڑ کر پھینک دے۔ اس کو ذرا بھی قرار و ثبات نہیں ہے۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (ایضاً آیت ۲۶)

کلمۂ طیبہ اسلام کا دعوتی کلمہ ہے جس میں توحید الوہیت اور رسالتِ محمدی کو پیش کیا جا رہا ہے جن کا جان کر اقرار کرنا ایمان کے لیے، قلب کے تزکیہ و تطہیر کے لیے، ضروری ہے، فرضِ اول ہے۔ تمام انبیاء نے اس توحید الوہیت کو پیش کیا ہے یہی ان کی بعثت و دعوت کا اصل مقصود تھا تمام پیغمبروں کے پیغام کا یہی نچوڑ تھا۔

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (۱۱: ۵۰) — "اے قوم! تم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود و رب نہیں۔"

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ (۱۲-۴۰) — اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

غرض توحید الوہیت پر سارے انبیاء اولین و آخرین کا اجماع ہے جو بھی رسول آیا وہ توحید کی دعوت لے کر آیا جیسا کہ قرآن ناطق ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ (پ ۱۷ ع ۲، ۲۵)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی مستحق عبادت ہے۔ اسی کی عبادت کی جانی چاہیے۔ اسی سے فقر و ذلت کی نسبت جوڑنی چاہیے، اقرار وجود باری تعالیٰ اور اس کی بندگی ہی تمام پیغمبروں کے پیغام کا حاصل ہے، یعنی صرف اللہ ہی اللہ رہے غیر اللہ بحیثیت الٰہ قلب سے فنا ہو جائے:

دلِ عاشق ز مے تست با عہد درست
جانِ طالب وصل تست از روز نخست
آں کس کہ نہ جست وصل تو ہیچ نیافت
واں کس کہ ترا یافت دگر ہیچ نہ جست (عطار)

قلب کی زمین میں وجود باری تعالیٰ کے یقین کی کھاد دے کر توحیدِ الوہیت کا تخم لگایا جاتا ہے۔ اس تخم کی آبیاری اُن اعمال و افعال سے کی جاتی ہے جس کو شرع کی زبان میں عبادت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عبادت لغت میں عبارت ہے "غایت تذلّل" سے، یعنی حد درجے کی نیازمندی و خاکساری سے اور شرع میں مراد ہے وہ افعال و اعمال و احوال سے جن کا تعلق خاص طور پر حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت سے ہوتا ہے۔ عبادت اسم جنس ہے اس کی انواع بہت سی ہیں:

عبادت اعتقادی | یہ اصل ہے سب انواع کی، اس کا دوسرا نام توحیدِ الوہیت ہے۔ محاورۂ قرآن میں عبادت کے معنی اسی توحید کے ہیں۔ یہ اس امر کا اعتقاد ہے کہ اکیلا اللہ ہی الٰہ ہے یعنی معبود و رب واحد احد ہے وہی خالق ہے اور اسی کا امر، وہی مالک ہے وہی حاکم، اسی کے ہاتھ میں نفع و ضرر ہے وہی مولیٰ ہے اسی طرح الوہیت کے دوسرے لوازم کا اعتقاد۔ لہٰذا دعا، ندا، استغاثہ، استعانت، التجا، رجا و خوف سب اللہ ہی سے ہوں غیر اللہ سے ہرگز نہ ہوں۔

عبادت لفظی | کلمۂ توحید کا زبان سے اقرار

عبادت بدنی | جیسے قیام و رکوع و سجود نماز میں۔

عبادت صوم و افعال حج | جیسے طواف، ذبح، نحر، حلق

عبادت مالی | حق تعالیٰ کے امتثالِ امر میں ان ہی کی رضا کے حصول کے لیے انفاق مثلاً زکوٰۃ، صدقہ وغیرہ — ذکر الٰہی — فکر و مراقبہ

مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ غیبی نفع کے لیے مخلوق جو کام کرتی ہے وہ عبادت ہے، اگر اس کی اجازت اللہ نے دی ہے (اذن باللہ) تو وہ اللہ کی عبادت ہے اگر اس کی اجازت اللہ نے نہیں دی (ما لم یاذن بہ اللہ) ۲۱ : ۴۲۔ تو وہ غیر اللہ کی عبادت ہے شرک ہے ظلم عظیم ہے۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ معرفت الٰہی اصل علم ہے۔ سارے علم کی تفصیلات کو چھوڑ کر پہلے اس معرفت کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

جز معرفت الٰہ ہیچ است ہمہ　　بگذر ز ہمہ معرفتے حاصل کن

یہ علم مشکوٰۃ نبی ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے، اس کو چھوڑ کر حکم خرد کے تابع ہونا بولہبی ہے، تشنہ لبی ہے، قلب کی زمین میں شجر خبیث کا بیج بونا ہے، جس کی نہ جڑ مستحکم ہوتی ہے اور نہ جس کی شاخیں بلند ہوسکتی ہیں جو زمین سے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جا سکتا ہے۔ "مالھا من قرار" (۲۶:۱۴)

قلب کی زمین میں "توحید الوہیت" کا تخم لگا کر "عبادت" کے ذریعے اس کی آبیاری کی جاتی ہے شرک و نفاق کے خس و خاشاک کو کلمے کے "لائے نفی" سے کھود کر پھینک دیا جاتا ہے، حق تعالیٰ کی ہر آن یاد "ذکر" سے ان کے خیال یا "فکر" سے، دوسرے الفاظ میں عبادت و معرفت سے، اس "شجر طیب" کی جڑیں مضبوط ہوتی جاتی ہیں، اس کی شاخیں آسمان تک پہنچ جاتی ہیں اور ہر آن حکم ایزدی سے اس کے پھل حاصل ہوتے جاتے ہیں۔

اس لیے قرآن کریم میں ذکر کثیر کا حکم دیا گیا ہے۔ اُذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا (احزاب ۳۳: ۴۱) نیز فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ (۴: ۱۰۳) نیز فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا (بقرہ ۲: ۲۰۰،۱۲۵) یعنی خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ کو یاد کرتے ہو، خدا کی یاد تو اس سے شدید تر ہونی چاہیے۔ سورۂ مزمل (رکوع اول) میں فرمایا "وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا" (۷۳: ۸) اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور اس کے ساتھ اس طرح جڑ جاؤ جس طرح کہ جڑنے کا حق ہے۔ تبتل ہی حقیقت ذکر قرار دی گئی ہے جو مذکور میں فنا ہو جانا ہے، (صوفیۂ کرام کی اصطلاح میں)۔ اب "ذکر کثیر" وہ ذکر ہے جو کسی حال میں فراموش نہ ہو (مجاہد) صوفیہ کی اصطلاح میں یہ "ذکر دوام" ہے، "یادداشت" ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں "اللہ نے اپنے بندوں پر کوئی عبادت ایسی فرض نہیں کی جس کی ایک حد معلوم و مقرر نہ کر دی ہو، پھر اہل عذر کو حالت عذر میں اس کو معاف نہ کر دیا ہو، لیکن ذکر ہی ایک ایسی عبادت ہے کہ اللہ نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی اور کسی کو اس سے معاف نہ فرمایا، الا مغلوب العقل کو، اور ہر حال میں اپنے ذکر کا حکم دیا۔" "قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ" یعنی کھڑے بیٹھے لیٹے یعنی شب و روز خشکی و تری میں، سفر و حضر میں، غنا و فقر میں، بیماری و صحت میں، ظاہر و پوشیدہ ہر حال میں خدا کی یاد

یا اس کا ذکر ضروری قرار دیا گیا ہے (ابن عباس رضی اللہ عنہ) قرآن کریم میں ذکر کے متعلق مختلف مقامات پر جو ہدایتیں کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ یہ ذکر محبت کے ساتھ ہو، اس کی تنزیہ و تقدیس کے دھیان کے ساتھ ہو، ادب ظاہری و باطنی کے ساتھ ہو، خشوع و خضوع کے ساتھ ہو، تبتل کے ساتھ ہو، یعنی مذکور میں فنا ہو کر ہو، کثرت یا دوام کے ساتھ ہو، بہ تضرع و بہ خفا ہو، غفلت کے ساتھ نہ ہو، ذکر میں کوئی وسوسہ یا خیال نہ آئے کہ موجب ہلاکت ہو۔ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵: ۷۸)

اسی طرح قرآن حکیم میں فکر فی الآفاق و فکر فی الانفس کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ شجرِ توحید مستحکم ہو۔ اس بارے میں مشہور و معروف آیت سورہ حٰمٓ سجدہ رکوع ۶ میں آئی ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِيْدٌ اَلَآ اِنَّهُمْ فِیْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِيْطٌ (۴۱: ۵۳،۵۴)

عنقریب ہم تمہیں اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کے انفس میں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان کو منکشف ہو جائے کہ خدا ہی حق ہے، کیا تمہاری تسلی کو کافی نہیں کہ تمہارا خدا ہر چیز کا شاہد حال ہے۔ سنو جی! یہ لوگ تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے بارے ہی میں شک میں ہیں، سن رکھو کہ وہ ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔

خدا کی نشانیاں آفاق میں بھی ہیں اور خود انسان کے نفس میں بھی، ان ہی نشانیوں پر فکر کرنے سے آدمی خدا کو پائے گا اور اس پر کھل جائے گا کہ خدا ہی حق ہے، اور اس انکشاف کے باعث اس کو لقائے رب کی طرف سے کوئی شک نہ رہے گا اور اس پر منکشف ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ ہر چیز پر محیط ہے۔ فکر فی الآفاق کو اصطلاحاً فکر کہتے ہیں اور فکر فی الانفس کو مراقبہ۔ اس فکر و مراقبہ سے توحید کامل ہوتی ہے اور یہ ایمان کامل حاصل ہوتا ہے کہ خدا ہی حق ہے اور ہمارا رب حق ہی ہر شے پر محیط ہے۔ اس ایمانِ کامل پر استقامت سے دوامِ حضور حاصل ہو جاتا ہے اور دوامِ حضور کی استقامت سے دوامِ شہود۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ: افضل الطاعات مراقبة الحق علی دوام الاوقات۔ یعنی

برترین اطاعت یا عبادت مراقبہ حق ہے دائماً (ابن عطا سکندری)۔

اسلامی تہذیب کی زمین قلب انسانی ہے، شک و انکار، کفر و شرک و نفاق کے خس و خاشاک سے اس کو یقین کی کھاد دے کر پاک و صاف کیا جاتا ہے، اور شجر طیب توحید الوہیت کا تخم اس میں لگایا جاتا ہے اور عبادت، ذکر و فکر سے اس کی آبیاری کی جاتی ہے۔ جب اس طریقے سے اس تخم کی پرورش کی جاتی ہے تو یہ پاک درخت اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے اس کی شاخیں آسمان تک پہنچتی ہیں اور ہر وقت اس میں پھل آنے لگتے ہیں۔ اب ہم ان پھلوں میں سے بعض کا بیان کریں گے۔

(۱) حریت: فقر و احتیاج انسان کی فطرت میں داخل ہے، ان ہی کو رفع کرنے کے لیے وہ ہر نفع و ضرر پہنچانے والی چیز کو اپنا "الٰہ" قرار دیتا رہا ہے، رفع احتیاج کے لیے ان سے اعانت طلب کرتا رہا ہے، ان سے ذل و افتقار کی نسبت قائم کرتا رہا ہے۔ اپنے جہل و نادانی کی وجہ سے ان کو مستقل طور پر نافع و ضار خیال کرتا رہا ہے اور یہی وہم اس کو اپنے سے کم تر مخلوق کے آگے سجدہ ریز کرنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔

جب توحید الوہیت کے شجر طیب نے زمین قلب میں اپنی جڑیں مضبوط کیں اور اپنی شاخیں بلند کیں تو پہلا ثمرہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان کی گردن صرف ایک ہمہ گیر، ہمہ دان، ہمہ توان ہستی کے آگے جھکنے لگتی ہے جس کے دست قدرت میں ساری کائنات کی باگ ہے، یہی ہستی ہماری "الٰہ" ہے ہماری خالق ہے، مالک ہے، ہماری رب ہے، مولیٰ ہے، حاکم ہے؛ اسی کے ہم مخلوق ہیں، مربوب ہیں، مملوک ہیں، محکوم ہیں، عبد ہیں۔ اسی کی ہم عبادت کرتے ہیں، اسی سے ہم محبت کرتے ہیں اور اسی سے تمام حاجات و مرادات میں بھیک مانگتے ہیں۔ یہی ذات غنی ہے اور ہم سب اسی کے فقیر ہیں اسی کے فقیر ہو کر ہم سارے عالم سے غنی ہیں۔ ع

کہ بستگان کمند تو رستگاران اند!

اب عبداللہ خلق کی غلامی سے کامل طور پر آزاد ہو جاتا ہے "رق اغیار" سے رہا ہو جاتا ہے۔ موجودات عالم میں سے وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتا فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳:۱۷۵)

پر اس کا عمل ہو جاتا ہے وہ نہ کسی سے امید و رجا رکھتا ہے نہ کسی سے بیم و خوف ۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (۳۹ : ۳۶) اس کو ساری کائنات سے غنی کر دیتا ہے وہ جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نافع ہے نہ ضار:

از خدا خواہم و از غیر نخواہم بخدا
کہ نیم بندۂ دیگر نہ خدائے دگر است

(۲) سکینت یا جمعیتِ خاطر: حریت کا لازمی نتیجہ سکینت یا جمعیتِ دل ہے، اس کی ضد، پریشانی اور تشتتِ قلب ہے۔ جمعیتِ ظاہرہ شاید اعمال کو شریعت حقہ کے مطابق آراستہ و پیراستہ کرنے کا نام ہے، یا تہذیب اخلاق ہے۔ جمعیت "جمع اسباب" کا نام نہیں اور نہ پریشانی عدم اسباب کا نام، جیسا کہ جہلاء کا خیال ہے، ان ہی جہلا کے حال کی خبر حق تعالیٰ نے دی ہے: تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (۵۹ : ۲) "تم شاید خیال کرتے ہو کہ یہ اکٹھے (اور ایک دل) ہیں، مگر ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں"۔ سکینت و جمعیتِ قلب ثمرہ ہے توحید کا، یہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب قلب کا "قبلۂ توجہ" حق کے سوا کچھ نہیں رہتا اس سے "غنا" پیدا ہوتی ہے۔ جو حق سے نیاز کامل حاصل ہو جانے کی وجہ سے خلق سے بے نیازی کا نتیجہ ہے، ایسی حالت میں انسان بقول بوعلی سینا "ہش دبش و بسام" شاداں و فرحاں و متبسم رہتا ہے (اشارات حظ تاسع) وہ "فرحان بالحق" ہوتا ہے، یعنی اس کی فرحت یا خوشی کا مبدا حق تعالیٰ ہوتے ہیں، اس کا دل دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں سے رہا ہو کر تمام احوال و مشاہدات سے یکسو و بے نیاز ہو کر کشش و تعلق ذاتی کے لحاظ سے احدیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور "تَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" (۷۳ : ۸) کا مصداق۔

(۳) جذبۂ عمل: غیر اللہ کی عبادت و عبودیت کا جو اجب گردن سے نکل گیا، حریت یا آزادی اور سکینت و طینتہ القلب مع اللہ کا جذبہ جب قلب میں پیدا ہو گیا، خوف غیر اللہ کا بھاری پتھر جب اس کے سینے سے اٹھ گیا اور انسان اپنے حقیقی مولیٰ کے آگے جھک گیا اور اس سے مانوس ہو گیا تو وہ اپنے مولیٰ کو رحیم و حکیم اور ودود و کریم پاتا ہے اور اس کو اپنے ہر امر میں متصرف سمجھنے

لگتا ہے، اور اس کے ہر فعل کو سراسر حکمت سے مملو دیکھتا ہے، اسی کے حکم کے مطابق اس کو اپنے کاموں میں وکیل بناتا ہے۔ فاتخذہ وکیلا (۷۳: ۹)۔ اسی کا فرمان ہے "کفیٰ باللہ وکیلاً" (۴۷: ۸) کہہ کر وہ آزادی و اطمینان کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاتا ہے۔ عمل کا لامتناہی جذبہ اس کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے، اس کی زندگی سرتاپا حرکت و عمل ہو جاتی ہے، تنگی و تلخی سے وہ نہیں گھبراتا، دنیا کے عمل عقبیٰ میں چل، باقی سودائے خام، کا نعرہ لگاتا ہے، بے باک مجاہد کی طرح کائنات کی تسخیر کے لیے قدم اٹھاتا ہے، کامیابی ہر قدم پر اس کے پیر چومتی ہے اور سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض (۴۵: ۲۰) کی بشارت اس کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے۔ اعلائے کلمۃ الحق کا داعیہ حرکت و عمل کی عجیب روح اس کے اندر پھونک دیتا ہے، خود غرضی، انانیت، نفسانیت ہویٰ و تمنا سے اس کا قلب فارغ ہو جاتا ہے اور "ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ" (۹۲: ۲۰) کو ہر آن پیشِ نظر رکھ کر اس کا ہر قدم آگے ہی کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور اسی جذبے کے تحت وہ دنیا کو نجات کا راستہ بتلاتا ہے اور اس کو آزادی، وحدت و مساوات، امن و فلاح، محبت و آشتی کا پیغام پہنچاتا ہے۔

اس مجاہد کی ہمتیں بلند ہوتی ہیں۔ اس کا قصد و عزم عزیمت پر ہوتا ہے، اس کی کمر استقلال مستحکم و مضبوط ہوتی ہے، غم و ملال اس کے دل کو توڑ نہیں سکتا، آفات و بلیات کے نزول پر وہ صبر کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ع ہر چہ از دوست می رسد نیکو است، صدمے اور صعوبتیں اس کی ہمتِ مردانہ میں کسی قسم کی کمزوری نہیں پیدا کر سکتیں، جانتا ہے کہ افضل الایمان الصبر و السماحۃ' برترین ایمان صبر و سخاوت ہیں، اور اللہ تعالیٰ علوئے ہمت کو پسند فرماتا ہے "ان اللہ یحب معالی الھمم"

ایسا مجاہد اس دنیا میں نور کی ایک شعاع ہوتا ہے جہاں وہ جاتا ہے تاریکیاں غائب ہو جاتی ہیں، وہ طمانیت، راحت و سکونِ قلب کا ایک روشن مینار ہوتا ہے اس کی صحبت ٹوٹے ہوئے دلوں کو سکینت بخشتی ہے۔ لوگوں کو اس سے بقول رومی "بوئے خدا" آتی ہے۔ وہ دنیا کے لیے رحمت ہوتا ہے!

(۴) توحید کے یہ ثمرات تو فرد کے لیے ہیں۔ اب معاشرے کے لیے جو برکات حاصل ہوتی ہیں

ان پر غور کرو:-

توحید یا ایمان باللہ کا لازمی نتیجہ خلق اللہ سے محبت ہے، اس لیے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ اس لزوم کی توجیہ یوں کی جا سکتی ہے: توحید الوہیت کی تعمیل میں تم نے یہ دیکھا کہ موحد کی توجہ کا قبلہ حق تعالیٰ ہو جاتے ہیں، وہ انہیں اپنا مولیٰ سمجھ کر اپنی تمام مرادوں اور حاجتوں کو ان ہی کے سامنے پیش کرتا ہے، وہی اس کی امید و رجاء کا ملجا و ماویٰ بن جاتے ہیں۔ ان ہی سے وہ محبت کرنے لگتا ہے اس لیے قرآنِ حکیم نے مومن کو حق تعالیٰ سے شدید محبت کرنے والا اقرار دیا ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲: ۱۶۵) محب کے دل میں محبوب کی محبت کے سوا دنیا و آخرت کی محبت باقی نہیں رہتی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک دل میں دو محبتیں جمع ہوں ع یک خانہ دو مہمان نگنجند! ہاں وہ وسائل وصول محبوب کو ضرور دوست رکھتا ہے، یہی مفہوم ہے اس حکم کا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ، (۳: ۳۱) اسی لیے حب خدا کی علامت حب رسول اور ہر اس شئی کی محبت ہے جو اللہ و رسول کی طرف منسوب ہو، دیکھو مجنوں نے کیا کہا تھا۔

اذل لال لیلی فی ھواھا

واحتمل الاصاغر والکبارا

"لیلیٰ کی محبت میں لیلیٰ کے دوست و احباب کے ساتھ نرمی و مہربانی سے پیش آتا ہوں اور چھوٹوں اور بڑوں کو برداشت کر لیتا ہوں" مشہور کہاوت ہے کہ من یحب انسان "یحب کلب محلتہ"۔ جب کوئی شخص کسی کو دوست رکھتا ہے تو اس کے محلے کے کتے کو بھی چاہتا ہے۔ جب مجنوں کو کسی نے ملامت کی کہ تو لیلیٰ کے کتے سے کیوں محبت کرتا ہے، وہ تو منقد خودرا بلیے می منترد" تو مجنوں نے اس ظاہر بیں کو جواب دیا۔

گفت مجنوں تو ہمہ نقشی و تن | اندر آ بنگر تشبے از چشم من
کیں طلسم بستہ مولیٰ ست ایں | پاسبان کوچہ لیلیٰ ست ایں

محبت جب قوی ہو جاتی ہے تو محبوب سے تجاوز کر کے ہر اس شئے سے متعلق ہو جاتی ہے

جو محیط بالمحبوب ہے، اور باسباب محبوب ہے، یہ شرک فی الحب نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی محبوب کے پیغام پر یا اس کے پیغام کو دوست رکھتا ہے اس لیے کہ وہ اس کا پیام بر اور اسی کا پیام ہے تو اس کی محبت متجاوز الی غیر المحبوب نہیں ہوئی، بلکہ اس کے کمالِ محبت پر دلیل ہے۔ اسی لیے جب کسی کے دل پر اللہ کی محبت غالب آجاتی ہے تو وہ ساری خلق اللہ کو دوست رکھتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ اسی وجہ سے حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ "ساری مخلوق عیال اللہ اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے (بیہقی، کتاب الایمان)۔ ایک اور وقت آپ نے فرمایا "کونوا عباد اللہ اخوانا" اللہ کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ (بخاری) اور اس خدا کی، جو ہر شے کا رب ہے، قسم کھا کر فرمایا کہ "العباد کلھم اخوۃ" انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں (اخرجہ احمد، ابوداؤد)۔ عقلاء نے کہا کہ اصل عقل تو یہ ہے کہ "لوگوں سے محبت کرے اس طرح کہ حق ترک نہ کیا جائے" (کنوز الحقائق)۔ حقیقی زندگی تو محبت و اتحاد خدا کی محبت کا لازمی نتیجہ اس کی مخلوق سے محبت ہے، اس لیے عقیدۂ توحید اقوامِ عالم کے درمیان محبت و اتحاد کی ایک کڑی ہے۔ ایمان باللہ تو اس وقت کامل ہوتا ہے جب ہم اپنے بھائی کے لیے بھی اسی چیز کی خواہش کریں جس کی ہم اپنے لیے کرتے ہیں۔

گیرم کہ نمازہائے بسیار کنی
روزہ روزہ دہر بے شمار کنی
تا دل نہ کنی زغصہ و کینہ تہی
صد من گل بر سر یک خار کنی

قلبِ انسانی کو ہم نے تہذیبِ اسلامی کی زمین قرار دیا ہے۔ اس نے ایک منادی کی ندا سنی کہ "اپنے رب پر ایمان لا" وہ ایمان لے آتا ہے:

"رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا" (۳: ۱۹۳)

منادی محمد رسول اللہ ہیں، ایمان وہ قوتِ ایقانیہ و قدرتِ اتباعیہ ہے جو ہمارے باطن میں ودیعت کی گئی ہے، ربِ منادی ہمارا معبود خالق و رازق ہے، جو ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے، اقرار بایمان یہ ہے کہ منادی نے جو کچھ پہنچایا ہے۔ اس پر ایقان و اذعان رکھیں، اور اس کے مطابق عمل کریں۔ اس اقرار و ایقان و عمل سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ ربِ منادی کی محبتِ اطاعت، حریت، سکینت، اتحادِ انسانی، مساوات، امن و فلاحِ دنیوی و اخروی!

یہ ہے اسلامی تہذیب کا مفہوم، میری نظر میں! یہ ہے نقشہ اس شجرۂ طیبہ کا جس کی جڑیں زمین میں مضبوطی کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہیں جو ہر وقت اذنِ رب سے پھل لاتا ہے اور اپنے برکات سے کائنات کو مستفید ہونے کا موقع دیتا ہے اور اعلانِ عام کرتا ہے:

خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ " (۲: ۶۳)

(بقیہ: ریاست کا اسلامی تصور)

(صفحہ ۲۲۶ سے آگے)

اس کو ایک انسانی معاشرہ حاصل ہو، اس کے قبضہ میں ایک مخصوص علاقہ ہو، وہ داخلی طور پر باختلاف اور بیرونی حیثیت سے خود مختار ہو، اس کے پاس ایک سیاسی ادارہ (گورنمنٹ) ہو جو اس کے ارادوں کی تنفیذ اور اس کے مقاصد کی تکمیل کر سکے اسی طرح اسلامی ریاست یا خلافت بھی اپنے وجود پذیر ہونے کے لیے ان ساری چیزوں کی محتاج ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا لیکن جہاں تک دونوں کے اصول اور مقاصد کا تعلق ہے دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔

رسائل و مسائل

کسی حاکم کے آنے پر مستعدی کی نمائش

سوال: میں ایک ورکشاپ میں ملازم ہوں، مگر ہمیں کبھی کبھی باہر دوروں پر بھی جانا پڑتا ہے۔ ان دنوں ہمیں کام بہت کم ہوتا ہے اور اس وجہ سے ہم اپنے اوقات کے اکثر حصے یونہی بیکار بیٹھ کر گزارتے ہیں۔ لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا کوئی آفیسر یہاں سے گزرنے والا ہے یا گزر رہا ہے تو فوراً ہی ہم اِدھر اُدھر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیتے ہیں تاکہ آفیسر کو معلوم ہو جائے کہ ہم کچھ کر رہے ہیں۔ اور جب وہ گزر جاتا ہے تو پھر ہم آرام سے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور بعض مواقع پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم بے خبر بیٹھے ہوتے ہیں کہ وہ آفیسر وہاں سے گزر جاتا ہے یا عین موقع پر ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ گزر رہا ہے۔ اس وقت ہمیں تھوڑی سی گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے کہ پتہ نہیں کہ آفیسر کو ہمارے متعلق کیا خیال گزرے گا۔ اگرچہ میں اس قسم کا مظاہرہ بہت کم کرتا ہوں۔ لیکن کبھی میں بھی ایسا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں۔ جب بھی اس قسم کی صورتِ حال سامنے آتی ہے تو طبیعت بہت پریشان ہوتی ہے۔ بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ چیز بھی مجھے خدا کی عدالت میں مجرم بنا کر کھڑا کر دے۔ براہِ کرم اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرمائیں۔

جواب: اگر آپ اپنے کام میں جان بوجھ کر غفلت نہ کر رہے ہوں بلکہ کام نہ ہونے کی وجہ سے بے کار بیٹھے ہوں اور آفیسر کے آنے پر محض مستعدی اور مصروفیت کی نمائش اس لیے کریں کہ آفیسر کی طرف سے ناراضی کا خطرہ ہے تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ جان بوجھ کر کام چھوڑنے کی صورت میں ایسا کرنا ناجائز ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ ایک آفیسر ایسا بھی ہے جو ہر وقت ہر حال میں آپ کو دیکھ رہا ہے اور جس کو کسی جھوٹی نمائش سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا نیز جس کو سزا دینے کی طاقت تمام آفیسروں سے بڑھ کر ہے۔ جب کبھی آپ اور آپ کے ساتھی دنیا کے

چھوٹے چھوٹے افسروں کی آمد پر گھبراہٹ میں مبتلا ہوا کریں۔ اس وقت ذرا اس بڑے افسر کو بھی یاد کر لیا کریں

مصائب کے ہجوم میں ایک مومن کا نقطۂ نظر

سوال: میرا تیسرا بیٹا پونے چار سال کی عمر میں فوت ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اُسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے یہاں آکر پہلے دو لڑکے فوت ہوئے، اب یہ تیسرا تھا۔ اب کسی نے شبہ ڈالا تھا کہ جادو کیا گیا ہے جس دن سے یہ بچہ پیدا ہوا اُسی دن سے قرآنِ پاک کی مختلف جگہوں سے تلاوت کر کے دم کرتا رہا فرق صرف یہ ہوا کہ پہلے لڑکے پونے دو سال کی عمر میں فوت ہوتے رہے۔ یہ پونے چار سال کو پہنچ گیا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ جادو بھی چند الفاظ ہوتے ہیں۔ اس کے توڑنے کو قرآنِ پاک کے الفاظ تھے پھر دعائیں بھی بہت کیں۔ بوقتِ تہجد گھنٹوں سجدہ میں پڑا رہا ہوں۔ لیکن کچھ شنوائی نہیں ہوتی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات حاضر و ناظر اور سمیع و بصیر ہے۔ کیا حق تعالیٰ جادو کے اثر کے لیے مجبور ہی ہو جاتے ہیں؟ لوگ قبر والوں کے نام کی بودیاں رکھ کر اور پاؤں میں کڑے پہنا کر اولاد بچائے بیٹھے ہیں لیکن ہم نے اسے شرک سمجھ کر اس کی طرف رجوع نہ کیا لیکن ہمیں بدستور رنج اٹھانا پڑا۔ اکٹھے تین داغ ہیں جو لگ چکے ہیں۔ براہِ کرم اس غم و افسوس کے لمحات میں راہنمائی فرمائیں۔

جواب: آپ کے صاحبزادے کی وفات کا حال معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا۔ اور اس سے زیادہ افسوس یہ سُن کر ہوا کہ اس سے پہلے بھی دو بچوں کا صدمہ آپ کو پہنچ چکا ہے۔ اولاد کے یہ پے در پے غم آپ کے اور آپ کی اہلیہ کے لیے جیسے کچھ ناقابلِ برداشت ہوں گے اس کا مجھے خوب اندازہ ہے اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو صبر عطا فرمائے اور سکینت بخشے۔

آپ کے خط سے مجھے محسوس ہوا کہ دل پر پے در پے چوٹیں کھانے کی وجہ سے آپ غیر معمولی طور پر متاثر ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اس حالت میں نصیحت کرنا زخموں کو ہرا کر دینا ہے، اور مناسب یہی ہوا کرتا ہے کہ رنج و غم کا طوفانی دور ختم ہو جائے۔ مگر مجھے خوف ہے کہ اس دور میں کہیں آپ کے عقائدِ صالح پر کوئی آنچ نہ آجائے۔ اس لیے مجبوراً کہتا ہوں کہ آفات اور مصائب اور آلام کا خواہ کیسا ہی ہجوم ہو، مومن

کو اپنے ایمان اور اللہ کے ساتھ اپنے تعلق پر آنچ نہ آنے دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہم کو ہر طرح کے حالات میں ڈال کر آزماتا ہے۔ غم بھی آتے ہیں اور خوشیاں بھی آتی ہیں مصیبتیں بھی پڑتی ہیں اور راحتیں بھی میسر آتی ہیں۔ نقصان بھی ہوتے ہیں اور فائدے بھی پہنچتے ہیں۔ یہ سب آزمائشیں ہیں اور ان سب سے ہم کو بخیریت گزرنا چاہیے۔ اس سے بڑھ کر ہماری کوئی بدقسمتی نہیں ہو سکتی کہ ہم مصیبتوں کی آزمائش سے گزرتے ہوئے ایسے مضطرب ہو جائیں کہ اپنا ایمان اور اعتقاد بھی خراب کر بیٹھیں۔ کیونکہ اس طرح تو ہم دنیا اور دین دونوں ہی کے ٹوٹے میں پڑ جائیں گے۔ آپ کو جن صدموں سے دوچار ہونا پڑا ہے وہ واقعی دل ہلا دینے والے ہیں۔ لیکن اس حالت میں ثابت قدم رہنے کی کوشش کیجیے اور کوئی مشرکانہ خیال یا شرک کی طرف کوئی میلان یا اللہ سے کوئی شکایت دل میں نہ آنے دیجیے۔ ہم اور جو کچھ بھی ہمارا ہے، سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ ملکیت بھی اسی کی ہے اور سارے اختیارات بھی اسی کے۔ ہمارا اس پر کوئی حق یا زور نہیں ہے۔ جو کچھ چاہے عطا کرے اور جو کچھ چاہے چھین لے۔ اور جس حال میں چاہے ہم کو رکھے۔ ہم اس پر اس شرط سے ایمان نہیں لائے ہیں کہ وہ ہماری تمنائیں پوری ہی کرتا رہے اور ہم کو کبھی کسی غم یا تکلیف سے دوچار نہ کرے۔ یہ شانِ بندگی نہیں ہے کہ اللہ سے مایوس ہو کر ہم دوسرے آستانوں کی طرف رجوع کرنے لگیں۔ دوسرے کسی آستانے پر سرے سے ہے ہی کچھ نہیں۔ وہاں سے بھی اگر بظاہر کچھ ملتا ہے تو خدا ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ البتہ وہاں سے مانگ کر ہم جو کچھ پا سکتے ہیں؟ ایمان کھو کر ہی پا سکتے ہیں اور بہت سے بدقسمت ایسے ہیں جو وہاں ایمان بھی کھوتے ہیں اور مراد بھی نہیں پاتے۔ اس لیے آپ ایسے کسی خیال کو اپنے دل میں ہرگز نہ آنے دیں۔ اور صبر و اثبات کے ساتھ اللہ ہی کا دامن تھامے رہیں۔ خواہ غم نصیب ہو یا خوشی۔

جادو اور آسیب اور جفر وغیرہ میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سب پر حاوی ہے آپ اللہ سے دعا مانگتے رہیں۔ اسی سے پناہ طلب کرتے رہیں، اور اسی کا کلام پڑھ کر ہر آفت کو رفع کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ امید ہے کہ آخر کار اس کا فضل آپ کے شاملِ حال ہو گا۔ اور کوئی بلا آپ کو یا آپ کی اولاد کو لاحق نہ ہو گی۔

اُدھار کی صورت میں زائد قیمت وصول کرنا

سوال :- آج کل تجارت میں یہ رواج چل پڑا ہے کہ جو خرید و فروخت نقد رقم دے کر کی جائے اس کا بھاؤ بازار کے مطابق اور جو سودا ادھار لیا جائے اس کی قیمت بازار کے نرخ سے کچھ زائد وصول کی جاتی ہے۔ نقد اور ادھار میں قیمتوں کا تفاوت اب عام ہوتا جا رہا ہے۔ مفلس لوگ اپنی مجبوری کی بنا پر جانتے بوجھتے زیادہ قیمت ادا کر دیتے ہیں اور تاجر غریبوں کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اب حل طلب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی سودا بازی از روئے شریعت جائز ہے؟ کیا زیادہ رقم وصول کرنا سود کی تعریف میں نہیں آتا۔ براہ نوازش اس بارے میں پورے پورے دلائل کے ساتھ حقیقت کو واضح فرمائیں تاکہ جو لوگ فی الواقعی شریعتِ پاک کی پیروی کرنا چاہتے ہیں وہ پورے اطمینان اور شرح صدر کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو سکیں۔

جواب :- نقد قیمت کم اور اُدھار کی قیمت زیادہ رکھنے کے بارے میں تین احادیث مروی ہیں۔ پہلی حدیث جامع ترمذی، کتاب البیوع میں یوں مروی ہے: عن ابی ھریرۃ قال نھیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی بیعۃ، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معاملہ میں دو معاملے کرنے سے منع فرمایا ہے:" امام ترمذیؒ نے دو طریقوں سے روایت کرتے ہوئے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے اور پھر فرمایا ہے کہ اہل علم کا عمل اسی پر ہے اور بعض اہل علم نے اس بیع کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ ایک شخص کہے کہ میں تیرے ہاتھ یہ کپڑا نقد دس میں اور ادھار بیس میں بیچتا ہوں اور یہ طے نہ کرے کہ وہ نقد بیچ رہا ہے یا ادھار۔ البتہ اگر کسی بات پر تصفیہ ہو جائے تو مضائقہ نہیں:" (یعنی یہ کہ آیا مال نقد اس قیمت پر بیچا اور خریدا جا رہا ہے جو نقد خریدنے کے لیے تجویز ہوئی ہے، یا ادھار کے لیے تجویز ہوئی ہے)۔ آگے امام شافعی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ میں اپنا مکان تیرے ہاتھ اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ تو اپنا غلام میرے ہاتھ فروخت کرے۔ یہ حدیث سنن نسائی میں بھی انہی الفاظ کے ساتھ آئی ہے اور اس حدیث کے باب کا عنوان یہ مقرر کیا ہے: یقول ابیعک ھذہ

اسلعة بمائة درهم نقداً وبمائتي درهم نسيئة۔

دوسری حدیث مسند احمد میں ہے جس کے الفاظ ہیں: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن صفقتين في صفقة۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سودے میں دو سودوں سے منع فرمایا ہے۔ اس حدیث کے راوی سماک اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: هو الرجل يبيع البيع فيقول هو بكذا وهو بنقد بكذا وكذا۔ ایک آدمی ایک چیز بیچتے ہوئے کہتا ہے: ادھار کی قیمت یہ ہے اور نقد کی یہ۔ بہرحال ان دونوں احادیث کی ایک تاویل یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمتوں میں تفاوت مطلقاً ناجائز ہے۔ اس تاویل کے قائلین میں سے قابلِ ذکر اصحاب امام اوزاعی اور امام ابن حزم ہیں۔ دوسری تاویل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ تفاوت صرف اسی صورت میں ناجائز ہے جبکہ یہ بات صاف طور پر طے نہ ہو کہ سودا نقد ہوا یا ادھار۔ اس حدیث کی تیسری تاویل وہ بھی ہوسکتی ہے جیسے امام شافعی سے اوپر نقل کیا گیا ہے۔ مذاہبِ فقہیہ کے تتبع سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اکثریت تاویل اوّل کی قائل نہیں ہے، بلکہ دوسری یا تیسری تاویل ہی کو صحیح سمجھتی ہے۔

تیسری حدیث سنن ابوداؤد میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من باع بيعتين في بيعة فله اوكسهما او الربا (جو شخص ایک سودے میں دو قیمتیں مقرر کرے تو وہ یا تو کم تر قیمت لے لے، یا پھر سود ہوگا)۔ اس حدیث سے دو باتیں صاف صاف معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ بیعتین فی بیعۃ سے مراد یہی ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمت الگ الگ رکھی جائے، دوسری یہ کہ ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ سود ہے۔ اس حدیث کی کوئی دوسری تاویل محال ہے۔ نیل الاوطار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کے راویوں میں سے محمد بن عمرو بن علقمہ کے بارے میں کلام کیا گیا ہے، لیکن ابن حزم نے اسے صحیح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ فقد اخذ بهذا شريح۔ ابن حزم نے پوری سند کے ساتھ شریح کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ: اقل الثمنين او ابعد الاجلين او الربا۔ باعتبار اسناد ممکن ہے کہ اس حدیث میں ضعف کا کوئی پہلو ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا دو احادیث صحیحہ کی بھی کم از کم ایک

(باقی [illegible]

مطبوعات

قرآن پاک کا ترجمہ و تفسیر در زبان انگریزی) جلد اول از سورۂ فاتحہ تا سورۃ النسا) | از مولانا عبدالماجد دریا بادی ناشر: تاج کمپنی، لاہور بڑی تقطیع۔ صفحات ۴۹۱۔ قیمت درج نہیں۔ طباعت کا معیار بلند۔

کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا کام یونہی بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اس مشکل کا اندازہ اُس صورت میں کرنا بہت دشوار ہے جب کلام الٰہی کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا مسئلہ درپیش ہو اور دوسری زبان بھی ایسی جو عربی زبان سے نہ صرف قواعد کے اعتبار سے مختلف ہے بلکہ اندازِ بیان کے نقطۂ نظر سے بھی بالکل الگ اور جدا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے جس قدر انگریزی تراجم بازار میں ملتے ہیں۔ اُن میں بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ ان ترجمہ کرنے والوں میں بعض تو وہ لوگ شامل ہیں جو عربی سے بالکل نابلد ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو عربی تو جانتے ہیں لیکن اپنے سینے میں اسلام کے متعلق کینہ و حسد کی آگ رکھتے ہیں، بعض ایسے ہیں جن کے افکار تصورات یکسر باطل ہیں اور اس بنا پر وہ قرآن پاک کا ترجمہ اور تشریح اس انداز سے کرتے ہیں کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات تک مسخ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ایک مدت سے اس امر کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اللہ کا کوئی ایسا بندہ اٹھے جو ایک طرف انگریزی اور عربی پر قدرت رکھتا ہو اور دوسری طرف قلب و نظر کے اعتبار سے مومن ہو اور وہ اس عظیم خدمت کو سرانجام دے۔ مقام شکر ہے اس کام کے لیے اسی قسم کی ایک شخصیت مل گئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے بعض نظریات سے کسی شخص کو اختلاف ہوسکتا ہے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس دور میں وہی ایک شخص ہیں جو انگریزی اور عربی سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کے متعلق ایک صحیح نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ اُن

میں تجدد پسندی کے وہ رجحانات نہیں ملتے جو ہمارے اس دور کے بعض انگریزی جاننے والوں میں پائے جاتے ہیں۔ وہ قرآن پاک کی اُسی تشریح کے قائل ہیں جو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے جلیل القدر اصحاب نے کی۔ اپنے اسلاف سے انہیں گہری محبت اور وابستگی ہے۔ پھر وہ ان تمام کوچوں سے نہ صرف آشنا ہیں بلکہ قریب قریب گزرے بھی ہیں جن میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان عام طور پر بھٹک جاتے ہیں۔ اس لیے وہی اس کام کو احسن طریق سے کرنے کے اہل ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس کام کو بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔ البتہ اس میں بعض چیزیں تبصرہ نگار نے محسوس کی ہیں جن کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ تفسیری نوٹس میں اسرائیلیات پر بہت زیادہ اعتماد کیا گیا ہے۔ دوسرے ان نوٹس کے پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مترجم کے پیش نظر اسلام کی مدافعت ہے اور اس وجہ سے اُن کا اندازِ بیان اکثر مقامات پر اعتذار پسندانہ اور معذرت خواہانہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں ہم اُن کی مجبوری کو سمجھ سکتے ہیں۔ مغربی استیلاء کے بعد جب مسلمان ایک محکوم قوم بن کر رہ گئی تو اُس کے "خوب و ناخوب" کے معیار بھی مغرب سے درآمد کیے جانے لگے۔ ہر وہ چیز جسے اہلِ مغرب نے صحیح کہا وہ اُس کے نزدیک صحیح ٹھہری اور وہ چیز انہوں نے باطل قرار دیا وہ غلط ہو گئی۔ چنانچہ اس دور میں اسلام پر جتنے ممتاز لکھنے والے تھے انہوں نے نئی پود کو کفر و الحاد سے بچانے کے لیے یہی طریقہ مناسب سمجھا کہ تعلیماتِ الٰہی کو برحق ثابت کرنے کے لیے مغربی مفکرین کی آرا کو زیادہ سے زیادہ نقل کیا جائے۔ لیکن اب جبکہ مغربی تہذیب کا طلسم ٹوٹ چکا ہے اور مسلمانوں کے اندر یہ احساس ابھر رہا ہے کہ وہ پیغام الٰہی کے علمبردار اور عظیم الشان روایات کے حامل ہیں اس لیے یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ وہ مغرب سے مرعوب اور مغلوب ہوں۔ . . . . . احساسات کی اس نئی فضا میں وہ نوٹس جو آج سے کافی مدت پیشتر لکھے گئے تھے، کچھ پرانے معلوم ہوتے ہیں۔ انسان جو علمی کام بھی کرے گا۔ اس میں اپنے عہد اور حالات کا پرتو ضرور ہو گا۔ یہی حال اس تفسیر کا ہے۔ افسوس ہے کہ تاج کمپنی والوں نے اس کے

شائع کرنے میں غیر معمولی تاخیر کر دی۔ اگر یہ بروقت شائع ہو جاتی تو دوسرے ایڈیشن کے موقع پر اس میں وقت کے لحاظ سے مناسب تبدیلیاں کی جاسکتی تھیں۔

یہ وہ دو چیزیں ہیں جو ہم نے محسوس کی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات بلا خوف تردید کی جاسکتی ہے۔ کہ آج تک انگریزی زبان میں جتنے مشروح تراجم شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے بہترین اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ترجمہ یہی ہے۔

فاروق العزیز | تالیف: ابو الفاروق عبید اللہ صاحب ملتانی۔ ناشر: ادارہ احیاء السنۃ ملتان صفحات ۴۷۳۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

فاروق العزیز ایک ہونہار نوجوان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے دینی ذوق اور استعداد عطا فرمائی تھی۔ ان کے دل میں اشاعت دین کے لیے ایک گہری تڑپ تھی اور یہی تڑپ انہیں ہمیشہ بے چین رکھتی۔ اسی کی بدولت وہ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوئے اور بالآخر اسی راہ میں اپنے وطن، اور اعزا و اقارب سے دور جان جان آفرین کے سپرد کی۔ اور عین شباب میں بلکہ شباب کے آغاز ہی میں اپنے خالق سے جا ملے۔

اپنے نوجوان اور صالح بیٹے کی وفات پر باپ کا متاثر ہونا بالکل ایک فطری امر ہے مگر صاحب ایمان باپ نے دل بہلانے کے لیے بھی وہ طریقہ اختیار کیا جس میں تسکین بھی تھی اور خدمتِ دین بھی۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں انہوں نے دعوت و تبلیغ کی سیزدہ صد سالہ روداد بیان فرمائی ہے۔ اسلوبِ نگارش میں ایک دلکشی اور سوز ہے جو قاری کے دل کو شدید طور پر متاثر کرتا ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں فاروق العزیز مرحوم کی زندگی کے مختصر حالات اور اُس کے خطوط درج ہیں جن کے مطالعہ سے ایک انسان، جس میں ایمان کی کوئی رمق موجود ہو، بہت کچھ کام کی باتیں سیکھ سکتا ہے۔

پوری کتاب اس قابل ہے کہ اُس کا مطالعہ کیا جائے۔ معیارِ کتابت اور طباعت گوارا ہے۔

خدیجہ رضی اللہ عنہا | تالیف: محترمہ ثبینہ توفیق مصری۔ ترجمہ: شیخ محمد احمد پانی پتی۔ ناشر: مرکز اشاعت رام گلی نمبر ۴۔ برانڈرتھ روڈ۔ لاہور۔ صفحات ۱۱۱ قیمت ۲ روپے۔ طباعت

کا معیار عمدہ۔

یہ مختصر کتاب اُس محترم خاتون کی سرگذشت ہے۔ جسے سب سے پہلے حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف حاصل ہوُا اور جن کے متعلق خود سرور کائنات نے یہ فرمایا "خدیجہ نے اس وقت میری تصدیق کی جب تمام قوم میری تکذیب کے درپے تھی۔ وہ اس وقت مجھ پر ایمان لائی جب تمام لوگوں نے میری باتیں سننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اس وقت مجھ پر اپنا مال خرچ کیا جب کوئی شخص مجھے ایک درہم بھی دینے کے لیے تیار نہ تھا" زیر تبصرہ کتاب اسی پاکباز خاتون کا تذکرہ ہے جسے مصر کی ایک فاضل خاتون نے لکھا ہے اور جناب شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ کتاب بڑی ایمان افروز ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اس کا ہر مسلمان خصوصاً عورتیں اور بچیاں ضرور مطالعہ کریں۔

(بقیہ رسائل و مسائل)

تاویل ایسی کی جا سکتی ہے جو اس تیسری حدیث کی تائید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں شریعت کا ایک عام اور اہم اصول بھی اس حدیث کا مؤید ہے۔ وہ اصول یہ ہے کل قرض جرّ بہ نفعًا فھو ربا (ہر قرض جس سے نفع حاصل ہو وہ سود ہے)۔ مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی میں اس مضمون کی روایات موجود ہیں۔ اس اصول کی پشت پر نصوص کتاب و سنت، تعاملِ صحابہ اور اجماعِ فقہاء، تینوں موجود ہیں۔

اس ساری بحث کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمتوں میں فرق اگر حرام اور ممنوع نہیں تو مکروہ تو ضرور ہے اور اس کا ترک اور اس سے پرہیز اولیٰ ہے۔ حضرت عمرؓ نے غالبًا اسی نوعیت کے معاملات کے بارے میں فرمایا تھا کہ فاجتنبوا الربا والریبۃ۔

خـــالی صفحـــه

تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہء عمل

از

مولانا سید ابوالاعلی مودودی

یہ مولانا مودودی کی وہ تقریر ہے جو آپ نے فروری ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع عام میں کی تھی - اس میں آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ جماعت اسلامی ابتدا سے آجتک کس پالیسی پر کام کرتی رہی ہے - کن کن مراحل سے گذر کر آئی ہے - تقسیم ہند سے قبل حالات کیا تھے - ان حالات میں جماعت کا طریق کار کیا تھا - تقسیم کے بعد حالات میں کیا تغیر رونما ہوا اور اسکے تقاضے کیا تھے - ایک لا دینی ریاست کو اسلامی ریاست میں بدلنے کے لئے جماعت کا فریضہ کیا تھا اور اُس نے اسے کس حد تک انجام دیا - پیش نظر انقلاب اور اصلاح معاشرہ کی واحد صورت کیا ہے -

قیمت ۰۰-۱۲-۲ روپے

تزکیہء نفس

از

مولانا امین احسن اصلاحی

* انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد کیا ہے ؟
* انسانی معاشرے کی فلاح اور انسان کی نجات اخروی کا انحصار کس چیز پر ہے ؟
* کیا ,,تزکیہ،، کا علم کوئی راز ہے ؟
* کیا ,,تزکیہ،، کا اصل موضوع انسان کی محض انفرادی زندگی ہے ؟
* علم حقیقی کا سرچشمہ کہاں ہے ؟
* معرفت الٰہی کا صحیح مفہوم اور اسکے حصول کا صحیح طریقہ کیا ہے؟
* وہ کون سے عوامل ہیں جو معرفت الٰہی کے حصول میں حجاب اور سد راہ بنتے ہیں ؟

یہ جاننے کے لئے آپ مولانا اصلاحی کی تازہ کتاب تزکیہ نفس کا مطالعہ کیجئے

قیمت ۰۰-۸-۳ روپے

ملنے کا پتہ :

* مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ - لاہور
* سیل ڈپو مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی - مسلم مسجد